



مکمل ناول

میراجت

محرم ساجد

چاپ ابھری۔

”ٹرن..... ٹرن.....“

”ہیلو.....“ پھر چند لمحوں بعد..... ریسیور اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرا..... اس کے ارد گرد موجود دیواریں بھک سے اڑیں اور اس کے وجود پر آن گریں۔ وہ زانوؤں کے بل زمین پر یوں گری کہ ہاتھ

”ٹرن..... ٹرن..... ٹرن.....“

دس مرلے کے رقبے پر پھیلے اس گھر میں یہ آواز اس زور سے گونجتی کہ سیدھا دل پر پڑتی تھی۔

”ٹرن، ٹرن، ٹرن.....“

اتنے بڑے گھر کی خاموشی اس آواز سے ایک چھناکے سے ٹوٹی تھی اور پھر ذرا تیز، تیز چلتے قدموں کی

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2022ء

پہلو میں جا گرے..... ریسیور تار کے سہارے لٹکا.....
ڈول رہا تھا اور اس میں سے اب بھی آواز کے نام پر
اک نامانوس سا شور سنائی دے دیا۔

کہنے والے نے کیا اسے گمان و یقین سے پرے
کی دنیا کی کوئی کہانی سنائی تھی؟ کس کو م قاف کی داستان
سن بیٹھی تھی وہ کہ یوں اب بے روح آنکھوں سے دنیا کو
دیکھتی تھی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا اور سانس معمول کی آسانی
کے ساتھ نہ آتی تھی پھر اس نے گردن موڑ کر کانس پر
رکھی اس تصویر کو دیکھا..... اس کا دوسرا بھرنے والا
احساس رنج بھرے طیش کا تھا۔ ایک دم ہاتھ مار کر اس
نے فریم نیچے گرایا۔ شیشہ کیا کرچیوں میں ٹوٹا ہوگا..... کہ
جتنی کرچیاں اس کے دل، اس کے وجود کی ہو چکی تھیں۔
اس نے ان کرچیوں کے درمیان سے وہ تصویر کھینچ کر
نکالی..... چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر نفرت سے اس
پر تھوک دیا۔ اس کی نفرت محض تھوک دینے سے تو ختم
ہونے والی نہیں..... اور اب وہ اپنی جوتی کی ایڑھی سے
اس تصویر کا چہرہ مسل یا پھر رخ کر رہی تھی۔ جوتے سے
چہرہ ملتے، ملتے وہ ایک دم ساکت ہوئی۔ یوں جیسے وقت
تھا ہو، گھڑی ساکت ہو گئی ہو..... دل رک سا گیا ہو۔

”یہ میں نے..... میں نے..... کیا.....“ اس کے
ہونٹ پھڑپھڑائے اور شدید شاک کے عالم میں اس
نے ہاتھوں کی انگلیوں سے ہونٹوں کو ڈھانپا..... اگلا
رد عمل پہلے سے بھی شدید تھا۔ اس نے تیزی سے کانپتے
ہاتھوں سے تصویر اٹھائی، اڑتے بدن کے ساتھ اس نے
دوپٹے کا پلو پکڑنا چاہا مگر پلو ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا، اس کا
ہاتھ گرفت کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ لاچار ہو کر اس
نے تصویر اپنے کپڑوں سے رگڑ کر صاف کی اور پھر
دو لوں بازوؤں میں بھر کر سینے میں بھینچ لیا..... مگر وہ اپنی
چیچ بھینچ نہ سکی..... ایک نام چیچ کی صورت میں اس کے
لبوں سے آزاد ہوا تھا۔

اس کی چیچ نے شاخوں پر بیٹھے پُر سکون پنچھی اڑا
دیے تھے۔

☆☆☆

اگر اسے ایک لفظ ”بے اعتباری“ کا مترادف لکھنے
کو دیا جاتا تو وہ بلا سوچے سمجھے، بلا جھجکے لکھتا..... ”محبت“
اور وہ اسے دے بھی رہے تھے اپنی محبت کا واسطہ.....

اس نے سخت حیرت سے انہیں دیکھا۔
”بابا پلیز..... کیا کہہ رہے ہیں آپ، یوں نہیں
ہوتا..... کس قدر بچکانہ سی بات ہے کہ میں.....“
”بخت اس میں بچکانہ سی بات کیا ہے؟ ایک
پروپوزل رکھا ہے تمہارے سامنے اور بس.....“
”بس..... بس بابا.....؟“ اس نے شاک کی مگر سوالیہ
نظروں سے انہیں دیکھا۔

”آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے جانتے
نہیں..... سب کچھ جانتے، بوجھتے اور سمجھتے ہوئے بھی
آپ ایسی بات کر رہے ہیں۔“

”ہاں سب کچھ جانتے، بوجھتے ہوئے اور سمجھتے
ہوئے بھی ایسی بات کر رہا ہوں.....“ قطعی انداز
میں کہہ کر انہوں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

اس نے جڑے بھینچے ہوئے تھے۔ اٹے ہاتھ کی
دوا انگلیوں سے وہ مسلسل کپٹی کو مسل رہا تھا..... چہرے
پر برہمی کے تاثرات تھے..... یہ اس کے ٹینس ہونے کی
نشانی تھی۔ ”اور اگر ”وہ“ یہاں ہوتا تو.....؟“

”آخر ”وہ“ یہاں ہوتا ہی کیوں.....؟“ انہوں
نے تلخی سے سر جھٹکا۔

”کس قدر سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا ان کا یہ
بخت اور.....“ ایک گہری سانس ان کے سینے سے
خارج ہوئی۔

”بابا.....“ بخت نے اُن کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے۔
”ضروری تو نہیں یہ ہی آخری حل ہو..... ہم اپنی
پوری کوشش کریں گے..... آخری حد تک جا کر ان کی
مدد کی کوشش کریں گے..... یوں تھوڑی انہیں چھوڑ
دیں گے۔“

”جو کچھ ہو چکا ہے بخت..... اس کے بعد یہ
سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم بیان کر رہے ہو.....“
”آخر میں ہی کیوں بابا.....“ او بے طرح سے چڑا۔

بار اس کے حلق میں کچھ پھنسا تھا۔ اس نے طیش سے...
دونوں مٹھیاں بھینچیں اور دونوں آنکھیں زور سے میچیں۔

”ادا عبد المالك اتنی بے مول نہ تھی کہ جس قدر بے مول تم نے اسے کیا.....“ اپنے بنے والے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑ کر صاف کیا..... اور پھر نے تلے قدم اٹھاتی وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی..... اس نے غور سے اپنے چہرے کو دیکھا۔

ماتھے سے لے کر ٹھوڑی تک شہادت کی انگلی پھیری..... اس کی جلد بے داغ، بے حد چمکدار تھی۔ اس نے آنکھوں سے اپنی ہی آنکھوں کا جائزہ لیا..... ”کتنی ہی گہرائیوں کا مسکن تھیں یہ آنکھیں بالکل سیاہ یوں کہ کسی جنگل کی تاریکی ہو۔ کھوجاؤ تو مل کر نہ دو..... اور تم..... تم، تم ان سیاہیوں سے کیسے بچ کر نکل گئے..... کیسے؟“ اب کی بار اس نے گھوم کر خود کا جائزہ لیا..... اس کی لمبی چوٹی اس کی کمر کے گرد گھوم کر پشت پر جا پڑی..... اور اسے ایک دم کچھ اور یاد آیا۔

”تم واحد دنیا کی لڑکی ہوگی کہ جس کے بال گھٹکرالے بھی ہیں اور لمبے بھی..... آنکھوں سے جان چھڑاؤ تو دل ان میں پھنس کر رہ جائے.....“ وہ یاد کا ایک زہر بھرا کوڑا تھا جو دل کی زمین پر بڑے زور سے پڑا تھا اور سرخ ہوتی رنگت اس کے ضبط کی گواہی تھی۔ حسن تھا تو اس پر ناز بھی تھا اور یہ ناز کس طرح سے کرچی، کرچی ہوا تھا..... آہ..... تمہیں ادا عبد المالك اس مقام پر پہنچ کر دکھائے گی کہ جس مقام پر دیکھ کر تم پچھتاوے کی اس آگ میں جا گرو گے جو تمہیں جلائے تو ضرور پر بھسم نہ کرے گی..... تم دیکھو گے..... کہ تمہیں ادا عبد المالك کی آہ، کیسے لگے گی..... اور یوں لگے کہ ایک دنیا اس کا تماشا دیکھے گی۔“ طیش، نفرت، غصہ، غم، تکلیف، رنج کے زیر اثر اس کے آنسو بھل، بھل بہتے تھے اور وہ واقعی ہی کسی کو کھا جانے والی ”آہ“ لگتی تھی۔

☆☆☆

اسے دیکھ کر سب چونکنا چاہتے تھے..... پر ان سب نے اپنے اس reflex ایکشن پر فوری طور پر

”تم کیوں نہیں بخت.....؟ پسند کرتے تھے ناں

اسے تو پھر.....“

اور بخت نے ایک دم نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور جن نظروں سے دیکھا..... وہ انہیں زمین میں گاڑ دینے کے لیے کافی تھیں۔

”پسند کرتا تھا..... پسند کرتا ہوں..... نہیں.....“

کیسا سرد لہجہ تھا۔

”لو پسند بھی بھلا بدلی ہے کوئی.....“ وہ بچوں کے سے لہجے میں بولے۔

”بدلتی تو نہیں پر ماری پڑ جاتی ہے بابا..... جب رشتوں کے حوالے بدلتے ہیں تو اس کے ساتھ، ساتھ تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک تقاضا تھا کہ میں ہمیشہ کی طرح.....“ اور کوئی شکوہ کرتے، کرتے اس نے ترنت ہونٹوں کو بھیج کر خود کو روکا۔

”ایسا مت کہو بخت.....“ وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر تکلیف سے بولے۔

”تم جانتے ہو کہ بات محض تمہاری پسندیدگی کی نہیں تھی..... وہ.....“ اور اب کی بار بابا جان نے ہونٹ بھیج کر خود کو روکا۔

ایک تکلیف دہ خاموشی ان دونوں کے بیچ پھسکڑا مار کر آن بیٹھی تھی۔ وہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ پر چپ مگر سوچوں میں گم بیٹھے تھے۔

”تم جانتے ہو وہ تم سے قریب کبھی نہیں رہی.....“ اس خاموشی کو چھنا کے سے توڑتا ہوا وہ جملہ بابا جان نے کہا تھا۔ اور بخت عبد الرحمن کی آنکھوں تلے جیسے کچھ سلگ کر بھڑکا تھا۔ ایک منظر جیسے دل پر پاؤں رکھ کر یاد آیا تھا۔

☆☆☆

”میرے خدا یہ اس نے کیا، کیا میرے ساتھ..... کیا؟ کیوں کس لیے؟“ اس کی سانس مکڑی کے شکار کی طرح جسم میں پھنسنے لگی۔

”اتنے سال..... اس چہرے کو میں نے کسی دربار کا سا درجہ دیا..... نظر جب بھی اٹھی محبت سے زیادہ عقیدت کے ساتھ اٹھی۔ اور وہ کہتا ہے میں.....“ اب کی

قابو پایا تھا۔

”السلام علیکم.....“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
”وعلیکم السلام..... کیا لوگ ناشتے میں؟“ ای

نے بڑے پیار سے پوچھا تھا۔

”ہر روز کیا لیتی ہوں امی.....“ اس نے مسکراتا
چاہا..... مگر اس کی کوشش ناکام ہوئی۔

”ارے ہاں..... یہ بھی کوئی بھونے کی بات ہے
بھلا.....“ وہ بٹاشت سے کہنا چاہتی تھیں مگر
افسوس..... وہ بھی بیٹی کی طرح ناکام ہوئی تھیں۔

”تار انہیں اٹھی ابھی.....“ اس نے ہاٹ پاٹ
اپنی طرف کھینچتے ہوئے ماں کی آنکھ کے آنسو کو نظر انداز
کیا..... آخر کیا ہی کیا جاتا ان آنسوؤں کا..... یہ تو اب
جزو لازم تھے زندگی کے۔

”اسے تو کالج گئے آدھا گھنٹا ہو گیا بیٹا.....“ اور
اس نے جیسے تھک کر وال کلاک کو دیکھا۔

”یا خدا..... یہ سانچہ مجھے کہاں، کہاں اور کیسے،
کیسے متاثر کرے گا.....“ وہ تو جیسے سب بھلائے بیٹھی
تھی..... اس کا دل چاہا کہ ایک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ
کر بیٹھ جائے..... یہ جو بناوٹی چولا اس نے پہن رکھا
تھا..... پھاڑ کر اتار ڈالے اور ماں کے گلے لگ کر بین
ڈال، ڈال کر روئے..... پر کیا کیجیے کہ بناوٹ آخری
سہارا تھی۔

”ابو..... آپ سے اک بات کرنی تھی۔“ اس
نے ہمت سے باپ کو مخاطب کیا..... اور باپ بدلے
میں یہ ہمت نہ دکھا سکا کہ اس کے چہرے کو دیکھ کر
جواب دے۔

”کہو.....“ وہ اسی طرح اخبار کے پیچھے خود کو
چھپائے ہوئے بولے۔

”کچھ کورسز کرنا چاہتی ہوں.....“ اور ابو نے
ایک دم اخبار نیچے کر کے اور امی نے نوالہ منہ تک لے کر
جاتا ہوا ہاتھ روک کر اسے دیکھا..... اور پھر ان دونوں
کا آپس میں نظروں کا تبادلہ ہوا..... جیسے وہ کچھ کہنا
چاہتے ہوں۔

”کیا ہوا؟“

”نہیں.....“ ہوا تو کچھ بھی نہیں..... مگر
ہم..... وہ..... اور رقیہ عبد المالک نے بیچارگی سے
اپنے شوہر عبد المالک کو دیکھا۔

”پڑھنا چاہتی ہو..... ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں
جہاں کہوں گی ایڈمیشن کروادوں گا..... پر بچے اس
سارے مسئلے کا حل پڑھائی کی آڑ میں راہ فرار تو نہیں
ہے ناں.....“

بات کہے بنا چارہ نہیں تھا..... سو عبد المالک نے
بلا تمہید بات کی۔

”آپ کو کس نے کہہ دیا ابو کہ پڑھائی کی آڑ میں
یہ راہ فرار ہے.....؟“
”تو پھر.....؟“

”میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں، خود
مختار ہونا چاہتی ہوں.....“

اس بات پر ایک بار پھر ان دونوں میں نظروں کا
تبادلہ ہوا تھا۔

”آپ دونوں بار، باریوں کیوں ایک دوسرے
کو دیکھ رہے ہیں۔ سیدھی طرح بتا کیوں نہیں دیتے کہ
آخر بات کیا ہے.....؟“ وہ بری طرح سے چڑی تھی۔
عبد المالک صاحب نے اک گہری سانس
بھری..... اک نظر اسے دیکھا اور.....

”بھائی جان نے اپنے بیٹے کا پروپوزل دیا ہے.....“
”کیا.....؟“ اسے ایک دم کرنٹ لگنے کا سا جھٹکا لگا
تھا..... اور معلوم نہیں کیوں اک منظر چھن سے دماغ کی
اسکرین پر روشن ہوا تھا۔

☆☆☆

منظر..... وہ منظر کیا تھا بھلا.....
”السلام علیکم تایا ابو.....“ اس نے اپنا سر اُن کے
آگے کیا۔

”وعلیکم السلام..... یہ تمہاری ماں کو سکون نہیں
ہے جو روز تمہیں خانسا ماں بنا کر بھیج دیتی ہے۔“ وہ اس
کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے بولے۔

آپ اپنی شوگر کے مزاج سے واقف نہیں.....“
”اور گرمی کے حالات ملاحظہ کیے آپ نے؟
درجہ حرارت دیکھا کیا آج کا.....؟“ وہ اپنے کام
میں مصروف رہتے ہوئے بولی۔

”اچھا..... ولید تو شام میں آئے گا..... بخت آیا
ہوا ہے یوں کرو اس کے ساتھ چلی جاؤ.....“

”بخت..... توبہ، توبہ استغفار..... سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ جا کر مجھے اپنے قل منعقد نہیں
کروانے..... اس کے تو پاس سے بھی گزرتے ہوئے
ڈر لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے کرنٹ مارے گا کرنٹ.....“ وہ
پوری کی پوری فریزر میں تھکی وہاں موجود اشیا کا جائزہ
لیتے ہوئے بلا ٹکان بول رہی تھی..... جیسی وہ خاموش
ہوئی تو یوں لگا سب خاموش ہو گیا ہے..... اس غیر
معمولی خاموشی نے اسے چونکایا..... اس نے سر باہر
نکال کر دیکھا تو.....

”یا خدا.....! دل ایک دم دھک کر کے رہ گیا تھا.....
بلا مبالغہ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا..... تایا ابو کے چہرے پر
شرارت اپنا دھمال ڈال رہی تھی اور وہ..... اس کا
چہرہ..... تھا تو ہمیشہ کی طرح ساٹ..... مگر وہ
نظریں..... اس کا ایکسرے کیا سی ٹی اسکین کر رہی
تھیں..... اس نے گھبرا کر دوبارہ سرفریز میں گھس لیا اور
وہ اپنے مخصوص بے نیاز انداز میں باپ سے کہہ رہا تھا۔
”بابا میں ذرا بارہا ہوں شام تک آؤں گا۔“
وہ بتا کر جانے لگا تو تایا ابو نے ”سنو بخت“ کہہ کر روک
لیا..... اسے روک کر انہوں نے فریزر میں تھکی فریز
ہوتی ادا کو دیکھا۔

”ادا کو ذرا سپر مارکیٹ تک تولے جاؤ..... کچھ
گروسی کرنی ہے۔ پھر چلے جانا دوستوں کی
طرف.....“ آگے بڑھ کر بازو سے پکڑ کر ادا کو فریزر
سے نکالتے ہوئے وہ بولے تھے۔

اور ادا نے ایسی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے کہتی ہو۔
”یہ غاؤل ہے تایا ابو۔“ وہ واقعی میں اس کے قل
کروانے کے چکر میں تھے..... ادا اب تپ کر انہیں

”کیوں بھی..... کوئی اعتراض ہے آپ کو
میرے آنے پر.....“ وہ اوپر اوڑھی کالی چادر اتار کر تہ
کرتے ہوئے بولی۔

”لو بھلا..... تمہارے آنے پر کس کو اعتراض
ہے..... جم، جم آؤ..... ہنسو کھیلو..... کھاؤ، پیو پر تم تو جو
کچن میں تھکتی ہو تو پھر شام کی ہی خبر لاتی ہو.....“
ان کے سامنے لان میں رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے
اس نے یہ جملہ سنا۔

”لگتا ہے بازاری کھانے کھا، کھا کر جی نہیں بھرا
یا پھر ڈاکٹر احتشام سے ملنے کا موڈ ہو رہا ہے آپ
کا؟“ شرارت بھری آنکھوں کے ساتھ وہ ہاتھوں کے
پیالے میں چہرہ رکھے کہہ رہی تھی۔ احتشام صاحب،
تایا جان کے دوست اور محتاج دونوں تھے۔

”یوں کرو دو تین کھانے، ذرا زیادہ مقدار میں بنا
کر فریزر کر جاؤ..... اتنے دنوں میں ہو ہی جائے گا
خانسا ماں کا بندوبست.....“ اور اس نے ہاتھ کے
اشارے سے جیسے ہوا میں بات اڑائی۔

”جیسے آپ تو اپنے صاحبزادے کو جانتے ہی
نہیں ناں..... کہاں کھائیں گے وہ فریزر ہوا
کھانا..... پھر فون کر کے مجھے بے نقط سنائیں
گے..... کہ کیسی سچی ہو ذرا جو خیال ہو۔ تایا کا.....“ ان
دونوں کا رخ اب اندر کو تھا۔

”اچھا! تو تم اس کے بے نقط سنانے کی وجہ سے
آئی ہو..... ویسے کوئی خیال نہیں ہے تمہیں ہمارا.....“
لبچہ مصنوعی خنکی لیے ہوئے تھا۔

”تایا ابو.....! ادا نے منہ پھلا کر انہیں دیکھا اور
وہ ہنس دیے۔

”اچھا چلو..... مجھے بتاؤ کیا لانا ہے..... میں
لائے دیتا ہوں.....“ باتیں کرتے، کرتے وہ دونوں
کچن میں آچکے تھے اور اب وہ کپہنٹس کھول، کھول کر
خوراک کے ذخیرے کا اندازہ کر رہی تھی۔ اس بات پر
اس نے مڑ کر تایا کو دیکھا۔

”آپ جائیں گے گروسی کرنے..... لگتا ہے

دیکھ رہی تھی اور وہ بخت کو.....

”سوری بابا..... میں.....“

”ٹھیک ہے تم جاؤ..... میں لے جاتا ہوں اسے ایک تو وہ خدمتیں کرے (اور بخت منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”کون سا میری کرتی ہے“) اور اوپر سے ان کے خڑے بھی دیکھے.....“ ادا کی نظروں کی پیش ساری کی ساری ان کے لہجے میں آن کھٹی تھی۔

اور ان دونوں نے بیک وقت انہیں دیکھا۔

”یہ بڑے بوڑھے..... بڑے کیوں ہو جاتے ہیں..... بچے کے بچے ہی رہا کریں ناں.....“ ادا نے جل کر سوچا۔

اور بخت نے اک ٹھنڈی سانس لی۔

”گاڑی نکال رہا ہوں آجاؤ.....“ کہہ کر وہ رکائیں۔

کچن کاؤنٹر پر پڑی چادر اٹھا کر وہ ہبڑ دہڑ میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

گاڑی میں بیٹھی وہ خواہ مخواہ ہی غروس ہوئی جارہی تھی۔ ابھی تو وہ کچن کا ٹھیک طرح سے جائزہ بھی نہیں لے پائی تھی۔ لسٹ بھی نہیں بنائی تھی کہ کیا، کیا خریدے گی۔ وہ بے طرح سے الجھی۔ ادا نے چور نظروں سے بخت کو دیکھا۔ بے تاثر چہرہ۔

”کچھ ہوگا بھی تو وہ چہرے سے کب معلوم ہونے دے گا.....“ پریشانی میں اس نے عادتاً انگلیوں کے ناخن منہ میں ڈالے..... اور ترنت اس کے ہاتھ پر ایک نظر پڑی تھی۔ ادا نے منہ کھول کر اسے دیکھا۔

”میرے خدا!“ وہ تو سمجھی تھی کہ اس کا دھیان صرف ڈرائیونگ پر تھا۔ ”میتا“ اور پھر کلس کر اسے ایک خطاب دیا تھا۔ ظاہر ہے دل ہی دل میں..... اور جب اندر جا کر وہ ہر اک ریک میں رک، رک کر سوچ، سوچ کر جھنجھلا کر چیزیں رکھ رہی تھی تو بخت نے اک گہری سانس بھر کر ٹرائی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”یہ کریں گی گروسری.....“ ادا نے اسے... بڑبڑاتے سنا تھا..... وہ جھل ہوئی۔

آدھا گھنٹا لگا تھا بس..... اور وہ اسے کسی نہایت

144 ماہنامہ پاکیزہ - دسمبر 2022ء

سیلہ مند عورت کی طرح گروسری کرتے دیکھتی رہی۔
”ہائیں یہ کیا چیز ہے؟“ اور بار، بار وہ اپنے اندر اٹھنے والے اس جملے کی تکرار کو دہاتی رہی۔

وہ دونوں ہی لدے پھندے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

اور جب وہ ترکاریوں کے لفافے اٹھائے کچن میں رکھنے جارہی تھی اور وہ کچن میں باقی سامان رکھ کر واپس آ رہا تھا تو..... تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ذرا سا جھک کر اس نے بڑی دھیمی سی اک سرگوشی میں بات کہی۔

”کرنٹ تو نہیں مارا ناں..... کہ مارا؟“ کہہ کر وہ رکائیں..... تاک کی سیدھ میں نکل گیا۔ اور وہ سن کر بس اک دم ٹھنک کر رک گئی تھی۔ سمجھ میں تو بڑی دیر بعد آیا کہ وہ کہہ کر کیا گیا تھا..... اور جب سمجھ آیا تو اس نے شک کھڑو کر اس کی پشت کو دیکھا۔

”ہائیں.....“ یہ کیا تھا؟ وہ تو بڑا کم مخاطب ہوتا تھا کجا کہ یہ انداز بے تکلفی.....

اور اگر ادا اس وقت بخت عبدالرحمن کے ہونٹوں پر کھلنے والی مسکراہٹ دیکھ لیتی تو جان جاتی کہ وہ کس قدر بے تکلف ہونے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

بڑا ہی جاندار احساس تھا..... دونظروں کا اپنی پشت پر..... وہ احساس آج تک ابھی تک اس کے اندر زندہ تھا..... یوں کہ جیسے یہ پہلے کا نہیں..... ابھی کہ ابھی وقوع پزیر ہونے والا واقعہ تھا۔ بابا کب کے جا چکے تھے اور وہ اسی لمحے میں گم تھا..... جو منظر دل پر پاؤں رکھ کر آیا تھا۔

وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ منہ کھول کر اسے تک رہی ہوگی..... اس کا یہ انداز کب کسی نے دیکھا تھا..... خاصا لیے دیے رہنے والا آدمی تھا وہ..... اور یہ..... یہ ادا عبدالمالک..... وہ آج خود پر خود ہی حیران ہوا تھا۔ اس نے ادا عبدالمالک کو بڑی عید کے موقع پر ہونے والے فیملی ڈنر میں نوٹس کیا تھا

عورت کے لیے ہو سکتا ہے۔ کسی عورت کے لیے یوں محسوس کیے جانے پر کوئی نارمل آدمی یہ بات سب سے پہلے سوچتا لیکن وہ بخت عبد الرحمن تھا..... اس کے لیے یہ آخری سوچی جانے والی بات بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے دلیل چاہیے تھی، وجہ چاہیے تھی..... محرک کو تلاشنا تھا..... کیا تھا..... وہ کیا تھا کہ اس نے ادا عبد المالك کو اس فیملی ڈنر میں بارہا نظریں اٹھا، اٹھا کر دیکھا تھا..... بیزار اور الجھا ہوا ہونے کے باوجود وہ گھوم پھر کر وہیں اسی نقطے پر آن پہنچا تھا..... اس کے دل نے بڑا فلک شکاف قہقہہ لگایا تھا اس بات پر..... اپنی حرکت پر وہ جھنجھلایا بھی مگر خود کو سوچنے سے باز نہ رکھ سکا۔

”وہ مارا.....“ ایک دم اس کی آنکھوں میں برق سی چمکی تھی۔ ولید..... ولید عبد الرزاق۔ یہ رہا اس وجہ کا نام..... وہ ہی وجہ جو ادا عبد المالك کو نوٹس کرنے کا باعث بنی..... ان دونوں کی وہ بے تکلفی..... ان کی نوک جھوک..... اس نے بڑی حیرانی سے اس بے تکلفی کو دیکھا تھا۔ وہ اور ادا ہم عمر تھے جبکہ ولید ان دونوں سے کچھ بڑا تھا۔ اصولاً یہ بے تکلفی اس کی بخت سے بنتی تھی مگر وہ یوں ولید کو ٹریٹ کر رہی تھی جیسے کوئی ہم عمر دوست ہوتا ہے۔

ہر دفعہ میز پر وہ کوئی ڈش رکھتی اور کہتی..... ”یہ چکھ کر دیکھیے گا ولید بھائی! میں نے خود بنائی ہے۔“ اور ہر دفعہ وہ منہ اٹھا کر اسے دیکھتا مگر بڑی ہی بے تاثر نظروں سے..... اور جب وہ سب کے لیے چائے بنا کر لائی تو ولید کے لیے خاص طور پر کشمیری چائے بنا کر لائی تھی حالانکہ یہ پروٹوکول تو بخت کا بننا تھا کہ وہ یوں فیملی ڈنر میں بھی بہت کم شرکت کرتا تھا اور تو اور ادا نے بخت سے چائے میں چینی کتنی؟ جیسے سوال کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی مرضی سے شکر مٹس کر کے اسے چائے پکڑا دی تھی۔

”ویٹ آمنٹ۔“ وہ بری طرح سے چونکا۔ ”یہ میں کیوں..... اس طرح کا موازنہ کر رہا ہوں۔ وہ بھی ولید عبد الرزاق سے..... مائے گڈنئس۔“ اس نے...

اور یوں نوٹ کرنے پر بھی اس نے بڑی حیرت سے خود کو دیکھا تھا۔ ”بخت عبد الرحمن..... کسی لڑکی کو اس طرح سے نوٹ بھی کر سکتا ہے؟ کیوں..... بخت عبد الرحمن دل کے بنا زہن پر اتارا گیا ہے کیا؟“ دماغ نے بڑا ہی تنقید کر ایک ابرو اچکا کر جواب دیا تھا۔ اور گھر آ کر اس نے کتنی دیر سوچا، کتنا وقت لگایا تھا اس معے کو حل کرنے میں کہ آیا اس نے ادا عبد المالك کو کیوں نوٹس کیا تھا..... کیوں؟ کیا محض دل کے چاہنے پر؟ یونہی.....؟

”ارے جاؤ یار..... آج تک میں نے خود پر تمہاری مرضی چلنے دی کیا.....؟“ اس نے اپنے ہی دل کا مسخراڑایا۔

”بیٹے..... اب ذرا یہ کام کر دکھانا..... میں بھی ادھر ہی ہوں اور تم بھی.....“ دل نے منہ پر ہاتھ پھیر کر جوابی مسخراڑایا تھا۔

”آخر کیا تھا..... اس میں جو نوٹس ہوا تھا.....“ اس نے زاویہ سوچ بدل کر دیکھا۔ صوفے پر نیم دراز، ٹائٹس سامنے میز پر رکھے ہوئے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے، مسلسل ہونٹوں پر شپ کر رہا تھا۔ ایک پاؤں بھی لاشعوری طور پر مسلسل حرکت میں تھا..... اور وہ خود بھی مسلسل اس ”وجہ“ کی کھوج میں تھا جو یوں ایک لڑکی اس کے دھیان میں آئی تھی۔

لباس، چہرہ، مسکراہٹ، اس کی گفتگو (جو کہ یقیناً اس سے نہیں تھی) اس کے بنائے گئے کھانے۔ کیا؟ آخر کیا..... ان سب میں سے کوئی بھی لک ایسی وجہ یا بات نہیں تھی جو بخت کے لیے غیر معمولی ہوتی تو کیا پھر کیا؟ وہ الجھنے لگا تھا..... (اور یہ میں آپ کو بتا دوں کہ ابھی مگر بھی اس کے گمان میں نہیں آ سکتا تھا کہ وہ اسے کیوں نوٹس ہوئی تھی)

”لیواٹ یار.....“ اس نے بیزار ہو کر ٹھوکر سے میز کو پرے کیا..... وہ جتنا کمپوزڈ بندہ تھا جتنا عملی نقطہ نظر رکھتا تھا جس قدر cause and effect کا حامی تھا تو اس سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ اس جذبے کے بارے میں سوچتا۔ جس کا شکار ایک مرد، ایک

”تو اور کس سے کرو گے میاں..... ایک وہ ہی تو ہے جس سے ہر طرح کا، ہر قسم کا موازنہ کیا جاتا رہا اور کیا جاتا رہے گا۔“

”ولید عبدالرزاق...“ اس نے گہری سانس بھر کر خود کو بالکل ہی ڈھیلا چھوڑ دیا تھا اور اسی نام کی بازگشت اسے ماضی سے حال میں لائی تھی۔ بابا کو کئے گئے سختی دیر ہوئی، وہ نہیں جانتا تھا۔ کمر اتار کی میں ڈوبا تھا۔ اس نے جلتی آنکھیں موند کر کرسی کی بیک سے سر ٹکایا۔ اس کے ہونٹ کچھ بڑبڑائے تھے۔

“وليد عبدالرزاق.....!”

☆☆☆

SINCE 2014 وليد عبد الرزاق

کہانی کا وہ کردار تھا جو کہ کہانی شروع کرنے کا باعث بنا۔ ہر بچے کے لیے اس کا گھر ایک جنت ہوتا ہے۔ ولید عبدالرزاق کے لیے بھی تھا۔ ولید کے بابا اور اس کی ماں۔ وہ ان دونوں کی محبت کا بلا شرکتِ غیرے مالک تھا۔ ولید اکلوتی اولاد تھا۔ سو جی جان سے پیارا تھا۔ ماں، باپ کا بس نہ چلتا تھا کہ جہاں پاؤں رکھے وہاں پھولوں کی سیج بچھا دیں۔ زندگی ولید عبدالرزاق کے لیے فیری ٹیل تھی۔ وہ کوہِ قاف کا شہزادہ تھا کہ جس کی خدمت میں ماں سے لے کر کنیریں تک حاضر رہتیں۔ وہ ویسا ہی ایک بچہ تھا جیسے عموماً اکلوتی اولاد میں ہوتی ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود عبدالرزاق کے ہاں کوئی دوسری اولاد نہ ہو سکی تو توجہ کا مرکز خود بخود ولید ہی بنتا چلا گیا۔ اب یہ بھی نہیں تھا کہ اکلوتی اولاد ہے تو اسے لاڈ پیار کے چکر میں بگاڑ کر ہی رکھ دیں سو اس کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی رہی۔ ان تین نفوس کی زندگی بہت پرسکون گزر رہی تھی۔ پرسکون کے

146 ماہنامہ پاکیزہ — دسمبر 2022ء

بجائے آئیڈیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک متوازن شخصیت کا حامل بچہ تھا۔ ہونہار، لائق۔ ایک نارمل انسان میں جس قدر خوبیاں یا خامی ہوتی ہیں، وہ بھی انہی خوبیوں اور خامیوں کا مریض تھا۔ خامی سے پاک کوئی بشر نہیں ہوتا۔ بات تو یہ ہوتی ہے کہ آپ اگر ایک خامی کو خود پر حاوی ہونے دیں تو وہ برائی بن کر سامنے آتی ہے اور اگر کنٹرول کر کے دبائیں تو اچھائیاں سامنے آنے لگتی ہیں..... تو پھر فرد اسی بنا پر اچھا یا برا ڈیفائن ہوتا ہے۔

پانچ سال تک ولید عبدالرزاق ایک اچھا بچہ
ڈیفائن ہوتا رہا مگر پانچ سال بعد زندگی کی فیری ٹیل
جیسی کہانی جیسے یک دم کسی کالے جادو کے زیرِ اثر آئی
تھی۔ زندگی نامی پُر سکون جھیل میں ایک بہت بھاری
پتھر آن گرا اور اس پتھر کا نام تھا..... بخت

عبدالرحمن.....!

وہ آج بھی اس نام کے بارے میں سوچتا تو جسم میں بہنے والا ہونہ جانے کیوں ابلنے لگتا۔ اسکول سے کالج، کالج سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے پھر ابراؤ..... اس کی کامیابیوں کا شمار نہیں تھا۔ خاندان بھر میں وہ ایک ہونہار، لائق اور ایک ملنسار، خوش مزاج شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ اپنے گھر سے لے کر خاندان بھر تک سب پر حاوی تھا مگر اتنا کچھ پالنے کے باوجود اس کے دل میں یہ نام..... یہ نام بخت عبدالرحمن اتنے زور کی چٹکی کاٹا کہ وہ بلبلا اٹھتا تھا۔ اس نے کہاں، کہاں پیچھے نہیں چھوڑا بخت عبدالرحمن کو..... مگر پھر بھی..... پھر بھی اسے وہ سب نہیں بھولتا تھا جو اس نے پانچ سال کی عمر میں ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے تعلقات آج بھی بخت عبدالرحمن کے ساتھ سرد مہری لیے ہوئے تھے اور عجب بات یہ تھی کہ ایسا بخت کی وجہ سے نہیں تھا۔ ایسا اس شخصیت کی وجہ سے تھا جس نے اس کی ماں کو زک پہنچائی تھی۔

”ماں.....!“ جب یاد آتی تھی تو روح چھلنی ہوتی تھی۔ پانچ سال کی عمر میں زندگی کی پُر سکون جھیل

کے کتبے پر ہاتھ پھیرا۔

”شازیہ عبدالرزاق زوجہ محمد عبدالرزاق.....“

☆☆☆

شازیہ عبدالرزاق.....

وہ اپنے شوہر کی من چاہی بیوی تھی۔ وہ عبدالرزاق کی محبت تھی، ان کی پسند تھی اور پسند ایسی کوئی بے جا بھی نہ تھی۔ وہ خوب صورت تھی، طرح دار تھی۔ وہ کسی بھی مرد کی محبت کے لائق تھی۔ اس کی زندگی کتنی خوش و خرم گزر رہی تھی..... کتنی آئیڈیل گزر رہی تھی..... اتنی کہ اکثر سجدے میں سر رکھے وہ تشکر سے رو پڑتی۔ اسے ساس، سر کی طرف سے کوئی آزار ملا تھا نہ ہی شوہر کی طرف سے۔ وہ ایک ایسی دنیا کی بای تھی کہ جہاں ہر طرف محبت ہی محبت بکھری ہوئی تھی۔ اس کا شوہر اس پر جان چھڑکتا تھا تو ساس، سر اس کے سلیقے، نگہراپے کے قصیدے پڑھتے تھے۔ اور پھر شادی کے سال بعد ہی اللہ نے بیٹے جیسی نعمت سے نواز کر اسے جیسے کسی ملکہ کے تخت پر براجمان کر دیا تھا۔ وہ جتنا شکر ادا کرتی، کم تھا۔ مگر اس تخت شاہی کی مدت محض چھ سال رہی۔ ہاں، محض چھ سال..... چھ سال اس کا گھر اس کے لیے جنت بنار ہا مگر اس کے بعد اسے دوزخ میں بدلتے دیر نہ لگی۔

دیکھا جائے تو سب ویسا ہی تھا۔ ساس، سر سے لے کر عبدالرزاق تک..... مگر آگ تو دل میں بھڑکی تھی..... خاکستر تو اس کا مان ہوا تھا اور اس سب میں قصور کسی کا بھی بنتا نہ تھا۔ عبدالرزاق کا، نہ ان کے ماں باپ کا اور نہ ہی اس کا..... یہ برا وقت تھا جو شازیہ عبدالرزاق پر آن پڑا تھا لیکن یہ وقت ہی تھا جو ان سب پر بھی آن پڑا تھا۔ وہ سب اس وقت کے ہاتھوں مجبور ہوئے تھے۔ ان چھ سالوں کے بعد پھر کسی نے شازیہ عبدالرزاق کو ہنستے نہیں دیکھا۔ یہ دکھ..... مار گیا تھا اسے اس نے اس دکھ کے ہاتھوں محض مار نہیں کھائی تھی..... چار چوٹ کی مار ماری بھی تھی۔ عبدالرزاق نے تو چلو ایک آزار اسے پہنچایا..... اس نے تو

میں طوفان صرف ولید عبدالرزاق کے لیے نہیں اٹھا تھا۔ یہ اس کی ماں کے لیے بھی اٹھا تھا۔ اس حادثے نے اسے ماں سے نزدیک اور باپ سے دور کر دیا تھا اور پھر چاہ کر بھی عبدالرزاق اس کی شخصیت پر اثر انداز نہ ہو سکے تھے۔ ان کی ذرا سی بے توجہی نے کیا، کیا تھا۔ یہ وقت نے انہیں بڑے بے رحم طریقے سے بتا دیا تھا۔ اور یہ تو خود انہیں بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک ماں اپنے ہی بچے کے ساتھ کیا کر سکتی ہے۔ کیا ایک ماں اپنے بچے کو نفرت سکھا سکتی ہے؟ ہاں..... وہ سکھا بھی سکتی ہے کہ جیسے ولید عبدالرزاق کی ماں نے سکھائی۔ اس نے اگلے کئی سال صرف ولید عبدالرزاق کو پروان نہیں چڑھایا تھا۔ اس نے ساتھ ساتھ اس نفرت کو بھی پروان چڑھایا تھا جو اس کے اپنے بدن میں لہو کی طرح بہتی تھی۔

”امی.....!“ وہ ان کی قبر پر آیا تھا۔

”میں نے آج آپ کا بدلہ بابا سے لے لیا ہے..... میں نے انہیں بھی ویسے ہی تکلیف پہنچائی ہے جیسے انہوں نے آپ کو پہنچائی تھی۔“ ماں کی قبر پر ہاتھ رکھے وہ نم آنکھوں سے خاموشی کی زبان میں بات کرتا تھا۔

”وہ بھی اس تکلیف پر ساری عمریوں ہی روتے رہیں گے کہ جیسے آپ روتی تھیں۔ ساری..... ساری رات..... وہ اس تکلیف پر یوں ہی تڑپیں گے جیسے کہ آپ تڑپتی رہیں..... ساری عمر.....“

وہ..... وہی پانچ سال کا بچہ تھا کہ جس کی ماں واقعی میں ساری، ساری رات آنسوؤں سے اپنا تکیہ بھگوتی تھی۔ وہ وہی کم عمر بچہ تھا جو اپنی ماں کے رنجوں کا عینی شاہد تھا..... اس کے باپ نے عین جوانی میں اس کی ماں کی روح کا قتل کیا تھا۔ آج اس نے اپنے باپ کی روح کو ویسے ہی سرعام پھانسی دے کر..... ماں کا بدلہ لیا تھا۔

اس نے اپنی ماں کو باقی کی ساری عمر اس بناروح کے بدن کے ساتھ جیتے دیکھا تھا۔ اس کی ماں..... اس کی پیاری ماں..... ولید نے بہتی آنکھوں کے ساتھ قبر

کر سکے۔ ان کے گھر کا ماحول اسی طرح کا روایتی ہی تھا کہ جس طرح ایسے کیسز میں ہوتا ہے..... مگر وہ ہدیٰ تھی جس نے اس چیز کو بخت پر اثر انداز نہ ہونے دیا..... اب چاہے وہ ولید عبدالرزاق ہوتا یا شازیہ عبدالرزاق.....

عبدالرحمن کے بعد اس کی ساری دنیا اک وجود میں آن سائی تھی۔ عدت کے ماہ گزرے تو کچھ عرصے بعد اس کا نکاح عبدالرزاق سے ہو گیا کہ یہ مصلحت اور ان کے بیٹے بخت کے مستقبل کی وجہ سے مانگنا ہی تھا۔

کیا، کیا باتیں نہیں سنی..... کس، کس طرح کے الزام نہیں سہے اس نے..... انا اور خود داری کو کسی طوائف کی طرح بیچا اس نے..... صرف اور صرف بخت کے بخت کے لیے۔ وہ اس قدر مضبوط تھی اپنے ارادوں میں کہ شازیہ عبدالرزاق سے لے کر عبدالرزاق تک..... کوئی بھی اس پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب بخت اسکول جانے کے قابل ہوا تھا۔ اسے بخت کا ایڈمیشن کروانا تھا اور عبدالرزاق تو مہینوں اور پر نہیں جھانکا کرتے تھے۔ یہ شازیہ عبدالرزاق کی شرط تھی اس نکاح کے لیے کہ وہ ہدیٰ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ ایک طرف ماں، باپ کا اصرار..... دوسری طرف بیوی کا پریشر..... بیچ کی راہ انہیں یہی نظر آئی کہ شازیہ کی بات مان لی جائے۔ سو پچھلے تین سالوں سے وہ ”شرط“ کا بھگتان بھگت رہے تھے۔ ہدیٰ نے مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کیا مگر جب یکم کو بھی ”خرچہ“ بخت کی دادی کے ذریعے آیا تو اسے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے دوپٹا اٹھایا، اپنے گرد لپیٹا..... چپل اڑی اور دھڑ دھڑ کرتے نیچے جا پہنچی..... یہ کھانے کا وقت تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چنا جا رہا تھا۔ ولید اور عبدالرزاق ٹیبل پر موجود تھے جبکہ شازیہ کچن میں تھی کہ جی ان لوگوں نے وہ آواز سنی۔

”السلام علیکم.....!“ اور مارے حیرت کے اس کے ہاتھ سے روٹی نیچے جا گری۔ اس نے سشدر ہو کر

عبدالرزاق کو تاحیات آزار پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ ساری نفرت جو اس کے دل میں تھی، اس نے وہ ساری کی ساری نفرت اپنے بیٹے ولید عبدالرزاق میں اڈلی تھی۔ اس ہنسنے بستے لڑکی ملکہ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ عبدالرزاق کبھی اس پر سوتن بھی لاسکتے ہیں..... اور سوتن بھی وہ کہ جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر لائی تھی..... اپنے دوسرے نمبر والے دیور کے لیے..... کہا تھا ناں یہ وقت تھا جو کہ شازیہ عبدالرزاق پر آن پڑا تھا اور یہ وقت ہی تھا کہ جو ہدیٰ عبدالرحمن پر قہر بن کر ٹوٹا تھا۔

☆☆☆

ہدیٰ عبدالرحمن.....

عبدالرحمن کی بیوہ..... بخت کی ماں..... بخت نے بھی عجب بخت پایا تھا کہ جس دن پیدا ہوا، عین اسی دن باپ اس دنیا سے چلا گیا..... ادھر بخت نے دنیا میں آنکھیں کھولیں..... ادھر عبدالرحمن بارشوں کی وجہ سے کھجے میں آنے والے کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہو گئے۔ یہ کیسا حادثہ..... کیسا سانحہ تھا..... ہدیٰ کو تو صبر کرنے کی تلقین کرنا بھی اک مذاق لگتا..... اور وہ نومولود..... آہ! اس کا باپ اسے اپنے سینے کی گرمی، مزاج کی شفقت نہ بخش سکا اور باپ اس کے ننھے، ننھے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر باپ ہونے کا احساس بھی نہ پاسکا۔

اس عورت نے ہمیشہ اپنی زندگی میں بہت عجیب فیصلے کیے اور پھر ان فیصلوں پر ڈٹی رہی۔ اس نے بخت کی خاطر خود کو کبھی دوبارہ ماں کے عہدے پر قائل نہ ہونے دیا حالانکہ عبدالرزاق چاہتے تھے..... مگر وہ نہیں مانی۔ اسے بخت کی پرورش کرنی تھی۔ پیدا ہوتے ہی وہ زندگی کی جس ٹریجڈی اور کمی کا شکار ہوا تھا..... وہ اس کی و محرومی کو اس کی ذات یا کردار کا حصہ نہیں بننے دے سکتی تھی۔ وہ بخت کو ایک احساس محرومی کا مارا ہوا بچہ نہیں بنانا چاہتی تھی..... وہ اسے مضبوط بنانا چاہتی تھی تاکہ آئندہ آنے والی زندگی میں درپیش مشکلات کا مقابلہ وہ ایک میچور، سلجھ اور ایک کمپوزڈ انسان کی طرح

محبت کس سے کی جائے

دنیا سے؟

یہ رُلائی ہے

پھولوں سے؟

یہ تو مرجھا جاتے ہیں

دولت سے؟

یہ تو رشتے توڑ دیتی ہے

عروج سے؟

یہ تو منہ کے بل گرا پھینکتا ہے

خوشی سے؟

یہ تو وقتی ہوتی ہے

لوگوں سے؟

یہ تو بے وفا ہوتے ہیں

تو پھر آخر محبت کس سے کی جائے؟

اپنے آقا کریم حضرت محمد سے جو اس دن بھی

ساتھ نبھائیں گے جب ماں، باپ بھی اپنی اولاد کو

بھول جائیں گے۔

”تمہارا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوگا

جب تک میں تمہیں تمہارے جان، مال اور باپ

اور اولاد سے بھی پیارا نہ ہو جاؤں.....“

حدیث: رسول مقبولؐ۔ مسئلہ: فضلہ بتول، بہارہ کہو

نیند کی کمی فشار خون کا سبب

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ نیند کی کمی فشار خون کا

باعث بن سکتی ہے۔ جس سے عارضہ قلب کے

امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ چھین میں طبی ماہرین نے

اس ضمن میں جو تجربات کیے ان کے مطابق نیند کی کمی

سے دوران خون میں ایک خاص نوعیت کی تیزی آ جاتی

ہے، یہ تیزی دراصل نیند پوری نہ کرنے کی وجہ سے

ناآسودہ اعصاب کو سکون دینے کی لیے ہوتی ہے مگر جب

اس عمل میں باقاعدگی آ جاتی ہے تو وہ اعصاب نیند پوری

ہونے میں بھی خون کی زیادہ طلب کے عادی ہو جاتے

ہیں جس سے دل کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

مسئلہ: انیلا ناہید، لیہ

مڑ کر دیکھا۔

وہ..... وہاں..... ڈائننگ روم کے دروازے پر

کھڑی تھی..... اور حالت تو عبدالرزاق کی بھی ہلکی تھی۔

”سب خیر ہے ہدی.....؟“ یہ انداز تکلم..... یہ

استحقاق..... شاز یہ تو سر سے لے کر پیر تک جھلس گئی۔ یہ

لہجہ، یہ انداز اس کا حق تھا..... بس اس کا حق.....

”جی.....! بات کرنی تھی۔ آپ اگر اوپر

آسکیں۔“ شاز یہ نے اسے کہتے سنا۔ آنکھیں جھکی ہوئی

پر لہجہ مضبوط تھا اور یہی مضبوطی شاز یہ کو بھڑکا گئی۔

”جو بات کرنی ہے، یہیں کرو۔“ کچن سے نکل

کر وہ پھنکاری تھی اور ہدی..... اس نے تو جیسے سنا ہی

نہیں۔ وہ عبدالرزاق کو دیکھ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ..... کہو، کیا بات کرنی ہے؟“

عبدالرزاق مسئلہ بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔

”آپ کھانا کھالیں..... پھر آرام سے اوپر آ کر

بات کر لیجئے گا۔“

”تمہیں سنائی نہیں دے رہا..... جو بات کرنی

ہے، یہیں کرو..... اوپر جا کر بات کو کیا انوکھے پر لگ

جائیں گے..... جو یہاں نہیں ہو سکتی۔“ اتنا تنفر انداز

تھا کہ ہدی کا چہرہ سرخ تو ہوا مگر پھر بھی بے تاثر رہا۔

”آپ آرہے ہیں اوپر.....؟“ اس نے جس قدر

آرام سے پوچھا تھا، عبدالرزاق کا دماغ بھک سے اڑا۔

”جو ادا میں تم نے اوپر جا کر دکھانی ہیں..... وہ

یہیں دکھا لو..... میں معترض نہیں ہوں گی۔“ شاز یہ کا

لہجہ سرد مگر چبھتا ہوا تھا۔

”عبدالرزاق صاحب! مجھے اسی کے بارے

میں بات کرنی ہے کہ جس کے لیے میں نے اور آپ

نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے..... سو اگر آپ اوپر آ سکتے ہیں

تو ٹھیک ہے..... نہیں تو میں خود کو اپنی مرضی کرنے پر حق

بجانب سمجھوں گی..... پھر میں سمجھوں گی کہ بخت صرف

میر ہی ہوتے داری ہے۔“ اس پر تو جیسے شاز یہ کی گھٹیا

ہاتوں کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنے ہی آرام و سکون سے

کہہ کر اوپر تو چلی گئی مگر عبدالرزاق کا سکون برباد کر گئی۔

”آپ اور نہیں جائیں گے۔“ اس نے شازیہ عبدالرزاق کو کہتے سنا۔

”وہ آئے گا..... شازیہ عبدالرزاق..... وہ ضرور آئے گا۔ میں نے اپنے بیٹے کے لیے جو اکیلا ہے..... اس جائیداد و بزنس میں اس کے حق کے لیے..... میں کسی بھی حد تک جاسکتی ہوں۔ میرا بیٹا محرومی کی زندگی نہیں گزارے گا..... وہ بھی تمہارے بچے کی طرح ان سب کا حقدار ہے۔ وہ گر بخت کا تایا ہے تو اب باپ بن کر آئے گا..... وہ گر میرا شوہر ہے تو ضرور آئے گا..... تمہیں کیا لگتا ہے، ایک بیوہ کے لیے چھ سات ماہ بعد ہی دوسرا عقد کرنا آسان ہوتا ہے..... نہیں شازیہ عبدالرزاق..... نہیں..... میں نے دل پر پیر رکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا..... اور جب یہ ہو چکا تو تم دیکھو گی، وہ آئے گا..... ایک، ایک سیڑھی پھلا نکلتے ہوئے۔“ ہدیٰ عبدالرزاق کے دل میں اس یقین پر جیسے گرہ پر گرہ لگتی تھی اور وہ اتنی پُر یقین کیوں تھی.....؟ یہ یقین اسے خود پر تھا نہ بخت کے تایا پر..... یہ یقین اسے ”مرد“ کی فطرت پر تھا..... اس رشتے پر تھا کہ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر..... وہ آئے گا۔

ہدیٰ عبدالرزاق کوئی سستی سا وتری نہیں تھی جو وقت اور حالات کی مار کھا کر اپنے بیٹے کے لیے ایک مجبور زندگی کا انتخاب کرتی۔ وہ باشعور عورت تھی جو ہر جائز گُر آزما جانتی تھی۔ پھر شازیہ عبدالرزاق نے یہ بھی دیکھا کہ عبدالرزاق اوپری منزل کی سیڑھیاں چڑھے..... باوجود اس کے واویلا مچانے کے ان کے قدم ان سیڑھیوں کی جانب اٹھ گئے تھے..... وہ تو جیسے سناٹے میں گھرنی..... کھڑے قدم کے ساتھ وہ صوفے پر گری۔

”ماما.....!“ اسے روتا دیکھ کر ولید اس کے پاس آیا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ ”آپ کیوں رورہی ہیں ماما؟“

”تمہارے باپ نے رُلا یا ہے۔“

”بابا نے آپ کو مارا ہے؟“

”ہاں..... ہاں میری جان، بہت بری طرح مارا ہے..... میری روح کوئل کیا ہے اس نے..... جیتے جی

مار ڈالا اس نے مجھے.....“ وہ ولید کو دونوں ہاتھوں میں بھر کر پھوٹ، پھوٹ کر روئی تھی۔

”میرے بابا گندے تو نہیں ہیں۔“ ولید حیرانی سے پوچھتا تھا۔

”نہیں..... وہ ہیں گندے..... بہت گندے ہیں۔“ اور اس کی ماں روتی جاتی تھی۔

☆☆☆

”میرے بابا کون سے ہیں امی؟“ اور اس سوال پر ہدیٰ ساکت ہوئی نہ نکلی۔ اس نے بس اک گہری سانس بھری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سوال بخت نے کرنا تھا اور یہ وقت بھی آتا تھا۔

”ادھر آؤ.....“ اس نے پیار سے بلایا۔

”کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”وہ.....“ بخت ہچکچایا۔

”کھل کر پوچھو بخت.....!“ وہ اس کے ماتھے پر آئے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

”وہ، ولید کہتا ہے..... بابا میرے بابا نہیں ہے۔ تمہارے قادر نیم میں عبدالرزاق نہیں لکھا جاتا۔“ اور ہدیٰ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ بات ولید ہی اس سے کہہ سکتا تھا۔

”ولید سے کہاں ملے آپ؟“

”نیچے..... جب دادا کے لیے دعا ہو رہی تھی۔“ شازیہ اور ہدیٰ دونوں کے سر طویل عرصے کی علالت کے بعد دونوں قبل ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

”اچھا..... پھر اس نے بتایا آپ کو کہ آپ کے

بابا کون سے ہیں؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟ اسے بتانا چاہیے تھا ناں۔“

”میں نے پوچھا نہیں.....“

”آپ کو بھی پوچھنا چاہیے تھا۔“ اور بخت ماں کا منہ دیکھنے لگا۔ ایک سات، ساڑھے سات سال کا بچہ اب اس بات کے جواب میں کیا کہتا۔

”ولید غلط کہتا ہے ناں امی.....؟ بابا ہی میرے بابا ہیں ناں؟“ وہ اس ننھے دل میں اٹنے والے خوف

کچھ اور عرصہ گزرا تو ہڈی کی ایک اور ڈھال ٹوٹ گئی۔ بخت کی دادی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ زندگی کچھ اور سخت ہو گئی تھی مگر اسے ابھی عبدالرزاق کا سہارا تھا..... اسے یہ اطمینان تھا کہ چاہے اس کی ساری ڈھالیں ہی کیوں نہ ٹوٹ جائیں..... چاہے وہ خود ہی کیوں نہ رہے..... عبدالرزاق، بخت کے بابا تھے اور رہیں گے۔

شازیہ کو جو ساس، سر کا لحاظ تھا، وہ جاتا رہا تھا..... وہ اب کھل کر اور جم کر کھلتی تھی..... اور ہڈی کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا..... صبر۔

وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ تارا کی پیدائش پر عبدالمالک کے گھر عقیقہ تھا۔ عبدالرزاق نے ان سب کو اکٹھا لے کر جانا چاہا تھا۔ شازیہ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھی۔ ولید بچھے بیٹھا تھا کہ جب ہی وہ ہڈی اور بخت کو لے کر آئے تھے۔ ہڈی نے خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھنا چاہا تو ولید ایک جھٹکے سے باہر نکلا تھا۔

”میں اس عورت کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔“ وہ اس قدر بدتمیزی سے بولا کہ ہڈی ششدر رہ گئی اور عبدالرزاق کا منہ سرخ ہوا۔

”ولید.....!“ وہ دھاڑے۔ شازیہ بھی گھبرا کر باہر نکلی تھی۔

”پلیز عبدالرزاق..... آپ ان کو لے جائیے..... پلیز!“ ہڈی نے آگے بڑھ کر معاملہ بگڑنے سے روکا تھا اور اسی بات پر شازیہ کا موڈ بگڑا تھا۔

”بیٹھو بخت!“ کچھ سوچ کر انہوں نے بخت سے کہا اور ہڈی واپس مڑ گئی۔

”تم تیار رہنا۔ میں واپس آ کر تمہیں لے جاتا ہوں۔“ اسے مڑتے دیکھ کر عبدالرزاق نے کہا۔

”نہیں، اس کی ضرورت.....“

”جتنا کہا ہے، اتنا ہی سنا کرو..... آگے سے بولنے کی ضرورت نہیں۔“ ہاتھ اٹھا کر سرد لہجے میں اسے بولنے سے منع کرتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھتے تھے۔ پچھلی سیٹ پر ولید اور بخت کے بیٹھنے کا انتظار کیا اور پھر

سے اچھی طرح آشنا تھی۔ ہڈی نے ہونٹ بھیجے..... اس کے دل پر ہاتھ بھی بڑا..... مگر نہیں..... اسے بخت کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کرنا تھا۔ وہ انٹی..... اندر گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔

”یہ عبدالرحمن ہیں۔ یہ تمہارے بابا ہیں۔“ اس نے بخت کو وہ تصویر تھمائی۔ بخت نے شاک کے عالم میں تصویر کو نہیں، ماں کو دیکھا تھا۔

”عبدالرزاق تمہارے گارجین، تایا اور بابا بھی ہیں۔“ ہڈی نے تصویر اٹھا کر پھر سے اسے بخت کی گود میں رکھا۔

”پتا ہے بخت! کچھ بچے اللہ کے لیے بہت ایشل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہت پیار کرتے ہیں..... اتنا پیار کرتے ہیں کہ انہیں دو، دو بابا دیتے ہیں۔ آپ کے پہلے بابا جلدی اللہ کے پاس چلے گئے..... تو بخت تو بہت ایشل تھا ناں، اللہ تعالیٰ کے لیے..... تو اللہ نے بخت کو ایک اور بابا دے دیے..... وہ بابا آپ کے بابا بھی ہیں اور تایا بھی.....“ وہ اسے ساتھ لگائے پچکار کر کہہ رہی تھی۔

”پر ولید کہتا ہے کہ وہ بس ولید کے بابا ہیں۔“

”ہاں تو اس کے بھی ہیں۔“

”تو پھر کیا وہ میرے بابا نہیں ہیں؟“

”کیا آپ کو لگا کہ وہ آپ کے بابا نہیں ہیں؟“

اور بخت نے زور شور سے نفی میں سر ہلایا۔

”تو بس ولید کے کہنے سے کیا ہوتا ہے..... جس دن بابا نے یہ بات کہی ناں کہ وہ تمہارے نہیں، صرف ولید کے بابا ہیں..... اس دن سمجھ لینا بخت..... کہ وہ واقعی تمہارے بابا نہیں ہیں۔“ اسے سینے سے لگا لے ہڈی نے

بخت عبدالرحمن کو حقیقت کا پہلا تلخ جام اپنے ہاتھوں سے پلایا تھا۔ سات سال کے بچے نے اس جام کی نمی کو محسوس بھی کیا..... وہ ڈسٹرب بھی ہوا مگر پھر ڈٹ گیا کہ بابا جس دن کہیں گے..... اسی دن وہ خود کو یتیم سمجھے گا..... اور تاریخ بتلاتی ہے کہ وہ دن آج تک نہیں آیا تھا۔

گاڑی زن سے گیٹ سے نکلی تھی۔ وہ واقعی اسے دوبارہ آکر لے گئے تھے..... بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا مگر اس سب میں غلط اس وقت ہوا جب انہوں نے واپسی پر اندر جاتے ولید کو روک کر اپنے پاس بلایا تھا۔ اس نے رک کر ماں کو دیکھا۔ ماں کے اشارہ کرنے پر وہ باپ کے پاس آیا تھا۔

”آؤ۔“ وہ اسے ساتھ لے کر لان میں آگئے۔
”بیٹھو۔“ پھر کرسی کھینچ کر وہ بھی اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

”آج کے واقعے سے مجھ پر دو بچوں کی..... دو ماؤں کے کردار کھل کر سامنے آئے..... بخت تم سے چھوٹا ہے۔ اس نے تو یہ نہیں کہا کہ وہ شازیہ کے ساتھ نہیں بیٹھے گا۔“

”گاڑی اس کے باپ کی نہیں تھی جو وہ یہ کہتا۔“ وہ ایک بار پھر بھڑکا تھا۔ عبدالرزاق اس کے تنفر بھرے لہجے پر سن ہو کر رہ گئے۔
”گاڑی اس کے باپ کی تھی ولید!“ وہ بولے تو لہجہ پُر سکون مگر قطعیت لیے ہوئے تھا۔

”آپ صرف میرے بابا ہیں..... بخت کے گارجین ہیں آپ، بس۔“

”نہیں..... میں اس کا باپ بھی ہوں۔“
”کہنے سے کیا ہوتا ہے..... ولدیت کے خانے میں تو آپ کا نام نہیں آتا ناں۔“ وہ جیسے ہنسا تھا ان پر..... انہوں نے بہت مشکل سے ضبط کیا۔

”تم ہڈی کو ماں نہیں سمجھتے..... ٹھیک ہے..... تمہاری مجبوری مگر جس طرح کی بدتمیزی آج تم نے ہڈی سے کی..... کبھی بخت کو اپنی ماں سے کرتے دیکھا ہے؟“

”وہ کر کے تو دکھائے..... میں منہ نہ توڑ ڈالوں اس کا۔“

”اسے کہتے ہیں تربیت اور اس کا فرق..... تمہارا منہ توڑنے کا دل تو بخت کا بھی بہت کیا ہوگا..... مگر وہ کیا ہے ناں کہ تربیت آڑے آ جاتی ہے جو تمہاری ماں

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2022ء

شازیہ کو تمہاری کرنی چاہیے تھے مگر افسوس ایک عورت کی نفرت میں وہ اس قدر آگے بڑھ گئی کہ اپنی اولاد کو ہی کھائی۔“ وہ افسوس سے نفی میں سر ہلارہے تھے۔

”بخت کو کبھی غور سے دیکھا ہے ولید! کس قدر سلجھا ہوا ہے، کس قدر ٹھہراؤ ہے اس میں اور تم..... تم بڑے بھائی ہو اس کے۔ اپنا رویہ اور انداز دیکھو ذرا.....“

”نہیں ہے وہ میرا بھائی وائی.....“ وہ مشتعل ہوا تھا۔ اٹھ کر جانے لگا تو عبدالرزاق نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے دوبارہ کرسی پر بٹھایا تھا۔

”بخت یتیم ضرور ہے ولید..... مگر لاوارث نہیں ہے۔ وہ اس گھر، بزنس اور جائیداد میں تمہارے ساتھ برابر کا شریک ہے اور یاد رکھنا یہ حق میں نہیں، اس کے دادا اسے دے کر گئے ہیں۔ وہ اپنے باپ کے حصے کا وارث ہے..... یہ یاد رکھنا اور آئندہ اسے کبھی تھرڈ پرسن یا مجبور سمجھ کر ٹریٹ مت کرنا..... اب تم جا سکتے ہو۔“
عبدالرزاق نے تو اپنے سینے اسے سمجھانا چاہا تھا مگر وہ جو نفرت کا زہر تھا..... جو اس کے اندر اس کی ماں نے اتارا تھا..... وہ اتنا شدید تھا کہ ”سمجھ“ کے ہر دروازے پر عمر بھر کے لیے قفل لگا چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اس نے شازیہ سے کبھی نفرت نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ شازیہ کو اس کے برتاؤ میں حق بجانب سمجھا تھا..... مگر اس دن..... اس دن ہڈی عبدالرزاق کا جی چاہا کہ وہ اس عورت کا گلا دبا دے یا پھر اس گھر، اس زندگی سے کہیں دور بھاگ جائے۔

وہ کئی دنوں سے بخت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پریشان تھا۔ وہ اس سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کر رہا تھا اور اس سے کھنچا، کھنچا تھا..... مگر کیوں.....؟ ان دونوں ماں بیٹے میں تکلف جیسی چیز نام کو بھی نہیں تھی تو پھر کیا شے تھی جو بخت کا منہ سے جاری تھی۔

”بخت!“

”جی۔“

”کیا بات ہے؟“

”تمہارے لیے..... صرف اور صرف تمہارے مستقبل کے لیے۔ تمہارا اس گھر، جائداد اور اس بزنس میں برابر کا حصہ ہے۔ میری کسی اور سے شادی کروادی جاتی..... تمہیں میں اپنے ساتھ رکھ کر تمہیں تمہارے جائز حق سے دور کر کے ایک مجبوری کی یا کمپور ومانزڈ زندگی نہیں دینا چاہتی تھی اور اگر تمہیں یہاں دودھیال میں چھوڑ دیتی تو ماں کی طرح کون پالتا؟ تم یتیم ہوئے تھے..... تمہیں میں مجبور و مسکین نہیں بنانا چاہتی تھی۔ میرے ماں باپ مجھ پر شادی کا پریشر ڈالتے..... میں کب تک اُن کے سامنے کھڑی رہ سکتی تھی..... تمہارے دودھیال والے میری شادی کے بعد تمہیں مجھ سے لے لیتے..... بخت! میں کیسے تمہارے پنا جیتی؟ کیسے.....؟ تم میرا بخت تھے..... اور تمہارے بخت کے لیے میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا..... ہاں، میں نے خود تمہارے تایا کو نکاح کا پیغام دیا تھا..... زندگی خود تمہیں بتائے گی کہ تمہاری ماں نے غلط کیا یا صحیح.....“ اور وہ بخت کو سینے میں چھپا کر رو پڑی۔

تو زمانے نے اسے اپنے بچے کے لیے اٹھائے گئے ایک جائز قدم کے لیے بھی نہیں بخشا تھا اور اس رات..... اس نے ایک بار پھر اپنی روح کو پتھر تلے رکھ کر ایک فیصلہ کیا تھا۔ اس نے بخت کو بورڈنگ بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے خود سے دور کر دینے کا فیصلہ کیا اور اس ایک فیصلے کے بعد وہ زیادہ دیر جی نہیں سکی تھی۔ بخت میٹرک میں تھا کہ جب ہڈی نے اس دنیا کو خیر باد کہا تھا۔

☆☆☆

بخت عبدالرحمن!

ماں کے مرنے کے بعد اس نے چھٹیوں میں ایک بار گھر آنے کی غلطی کی تھی۔ حقیقت کے نام پر جتنے تلخ جام اس کی ماں نے اسے پلائے تھے..... تو یہ طے ہوا..... اب کے حلق سے نیچے اترنے والا جام..... ان سب سے زیادہ تلخ تھا کہ یہ زندگی نے اسے پلایا تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2022ء 153

”کچھ نہیں امی!“ اور امی نے گہری سانس لی۔ یعنی کہ بات خطرناک بھی جو اس سے چھپائی جا رہی تھی۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بات ہے..... کیا ہے؟ تم ہی بتاؤ گے تو ڈسٹرب نہیں رہو گے اور اگر نہیں بتاؤ گے تو پھر نتائج کی ذمے داری مجھ پر عائد نہ کرنا۔“ وہ بارہ سال کا بچہ..... واقعی اس بات کو سہا نہیں سکتا تھا۔

”وہ..... ولید کہتا ہے کہ آپ اچھی عورت نہیں ہیں۔“

”اچھا، پھر.....؟“

”پھر کیا؟ امی.....! اس نے یہ بات میرے سارے دوستوں کو بتادی ہے۔“ بخت کا لہجہ تپا ہوا تھا۔ ہڈی چوگی۔

”کون سی بات؟“

”یہی کہ..... یہی کہ.....“ وہ ہچکچایا۔

”یہی کہ کیا.....؟“

”کہ آپ نے بابا سے خود کہہ کر نکاح کیا تھا تو آپ اچھی عورت نہیں ہیں۔“

یہ بات ہڈی کے اندر کسی بھالے کی طرح اتری اور اسے سر سے لے کر پیر تک چیر گئی..... چند ثانیے وہ سفید رنگت کے ساتھ جوں کی توں بیٹھی رہی..... بخت کی تیز، کھوجتی نظروں کو جھیلی رہی۔ ولید کو یہ بات کس نے بتائی تھی، اسے چنداں تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

عبدالرحمن کے بعد آج پھر اس نے اپنے کمرچی، کمرچی وجود کو اسی طرح جمع کیا تھا جیسے اس کی وفات کے وقت کیا تھا۔

”بخت!“ اس نے بیٹے کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔

”ہاں! تمہارے بابا کو نکاح کا میں نے خود بولا

تھا..... خود پیغام دیا تھا..... مگر جانتے ہو کیوں.....؟“

”کیوں امی.....؟“ بخت کی آنکھوں سے آنسو

پھسل کر ماں کے ہاتھوں پر گرے تھے..... تو اس کی

ماں اچھی عورت نہیں تھی۔

اسے اپنے ہی گھر میں کھانا نہیں ملا تھا اور وہ اتنا حیران ہوا..... اتنا کہ شاک سے پورا ایک دن کمرے میں بند رہا..... عبدالرزاق کے پوچھنے پر انہیں یہی بتایا گیا کہ وہ خود نیچے نہیں آیا..... جب وہ اسے دیکھنے آئے تو..... ”ہا ہا! کیا اس وقت مری کوئی گاڑی جاتی ہوگی؟“ اور اس کی حالت سے زیادہ اس کے سوال نے انہیں جھکا دیا تھا۔

”کیوں؟“

”میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”مگر کیوں بخت؟“ وہ حیران ہوئے۔ اس کے چہرے کی نقابت ان سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

”یہاں امی بہت یاد آتی ہیں..... میں وہاں جا کر کوئی سمرکپ جوائن کر لوں گا تو آسانی رہے گی۔“ اور اس جواب نے تو گویا ان کی رگیں کھینچ لی تھیں۔ ”کیا سکھا کر گئی ہو بچے کو ہڈی.....؟“ شاز یہ کا کردار روایتی تھا..... ولید بھی روایت کا ایک حصہ تھا مگر یہ طے تھا کہ ہڈی اور بخت عبدالرحمن نے روایت کو اٹھا کر گٹر میں پھینکا تھا..... اسے کھانا نہیں دیا گیا تھا..... وہ جان گئے تھے۔

”بخت!“ انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔

”میں خود تمہارا داخلہ کسی سمرکپ میں کرواؤں گا۔ بس کچھ دن صبر کر لو..... بلکہ یوں کرو چچا کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں کچھ دن رہ لو..... تب تک میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا سمرکپ تلاش کرتا ہوں..... چلو اٹھو۔ شاباش! میں تمہیں عبدالمالک کی طرف چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ خود ہی اٹھ کر اس کا سامان پیک کرنے لگے۔ ”رہ لو گے ناں عبدالمالک کی طرف؟“ جانے کس خدشے کے تحت انہوں نے ہاتھ روک کر اس سے تصدیق چاہی تھی۔ اور پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اور پھر جب تک وہ بورڈنگ میں رہا، اس نے چھٹیوں میں گھر آنے کی غلطی نہیں کی۔ اس کے پاس ایک سو ایک مصروفیات ہوتی تھیں ان چھٹیوں کے لیے۔

شروعات مارگلہ کی پہاڑیوں پر ہائلنگ سے ہوئی اور پھر تو جیسے یہ شوق اس کے منہ کو لگ گیا تھا۔ کراٹ سے لے کر فیری میڈوز تک کہاں، کہاں کی خاک نہیں چھانی تھی اس نے..... پیسہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ عبدالرزاق اس کے اکاؤنٹ میں معقول رقم ٹرانسفر کر دیا کرتے تھے اور وہ..... وہ ان میں سے بھی بچاتا رہتا..... اپنے اسی ایک شوق کے لیے۔

وہ کوئی عام بچہ نہیں تھا جو پاکٹ منی کے نام پر ملنے والی اس رقم کو اڑا دیتا۔ اس کے پاس زندگی کے کچھ مقاصد تھے..... کچھ پلانز تھے، کچھ خواب..... فی زمانہ یہ سب پورا کرنے کے لیے پیسہ چاہیے تھا..... جو اس کے پاس تھا تو مگر وہ اسے عیاشی کے نام پر اڑا نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اوائل عمری سے ہی چھٹیوں میں جاب کرنی شروع کر دی تھی۔ زیادہ تر اس کا گزارہ ٹیوشنز پڑھانے پر ہوتا تھا..... ایک آدھ جگہ سیلز مین کے طور پر بھی کام کر چکا تھا اور گانڈ کے فرائض بھی انجام دے چکا تھا۔ یہ سب کرنے کے بعد اور کچھ پیسے اپنی پاکٹ منی سے جمع کرنے کے بعد وہ اس قابل ہوتا کہ کسی علاقے میں ہائلنگ کے لیے جاسکے۔ اس نے ایک ہائلنگ کلب بھی جوائن کر رکھا تھا۔ عبدالرزاق اس کے تمام معاملات سے آگاہ ہوتے۔ ان کے علم میں تھا کہ چھٹیوں میں وہ کہاں، کہاں کی خاک چھانتا ہے مگر ان کے علم میں یہ نہیں تھا کہ مگر، مگر کی خاک چھانے کے لیے وہ کون، کون سے پاڑ بیلتا تھا۔ بخت کی ماں نے اسے عام بچہ نہیں رہنے دیا تھا..... اسے اتنا مضبوط اور سمجھدار بنادیا تھا کہ کسی بھی قسم کے حالات اس پر اثر انداز نہ ہوتے..... وہ بہت کم پریشان ہوتا..... اس کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا..... وہ خود میں مگن رہنے والا انسان تھا..... اس کی قوت ارادی مضبوط تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات کی بھٹی میں پک کر کندن بننے کے بعد اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا۔

وہ لوگوں میں گھل مل نہیں سکتا تھا..... وہ expressive نہیں تھا۔ وہ اسکول، کالج سے

کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ولید نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تم تو آج بہت خوش ہو گے.....“ وہ چبھتے لہجے میں کندھے سے اس کا رکھا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔

”کسی کی موت پر کون خوش ہو سکتا ہے، حالانکہ لوگ پھر بھی ہوتے ہیں۔“ گاگلز اتار کر، سر کو ذرا سا جھکا کر وہ انہیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ اس نے ولید پر چوٹ کی گھی۔

”اور ان لوگوں میں سے تم بھی ہو.....“

”نہیں.....“ گاگلز دوبارہ پہنتے ہوئے، ہاتھ کر پر باندھتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

”تم ہو.....“ اور کہہ کر رکنا نہیں..... وہاں سے ہٹ گیا تھا..... اسے اپنی ماں کی موت کا دن یاد تھا اور ان دونوں ماں، بیٹے کا رویہ بھی۔ کہاں ناں بخت عبد الرحمن کی لغت میں دو ہی لفظ تھے یاں یا نہیں..... تیسرے کسی لفظ یا راستے کی گنجائش نہیں تھی..... وہ اپنے فیصلوں میں دو ٹوک تھا..... اور وہ معاف بھی ایک حد تک کرتا تھا، ہر شے کی معافی نہیں تھی۔

”ولید عبد الرزاق..... کچھ زخم اپنا انصاف مانگتے ہیں..... تو معلوم تو ہو ہی گیا ہوگا کہ جب ماں مرنے سے تو کیا ہوتا ہے.....“ اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

”بابا!“ رات جب سب چلے گئے اور اس کا باپ ٹڈھال لان میں اکیلا بیٹھا تھا تو وہ ان کے پاس چلا آیا۔ ان کے دونوں ہاتھ، اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے چومے تھے..... جو اب انہوں نے اسے ساتھ لگایا تھا۔

”میں مانتا ہوں آپ کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے، پر اپنا خیال تو رکھنا ہوگا ناں بابا..... میرے لیے تو رشتوں کے نام پر لے دے کر صرف آپ بچتے ہیں..... میرے لیے پلیز..... خود کو سنبھالیں.....“ اور انہوں نے ہلکے سے سر ہلایا..... پھر ایک گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

”یونیورسٹی کیسی جا رہی ہے؟“

لے کر خاندان تک میں ایک سرد مہر شخصیت کے طور پر جانا جاتا..... جس سے آپ ایک کے بعد دوسری بات نہیں کر سکتے تھے۔ اسے رشتے اس طرح سے میسر نہیں آئے تھے کہ جس طرح کسی بھی عام بچے کو میسر آتے ہیں اور یہاں ہڈی بھی مار کھا گئی..... وہ اس کی ذات کے اس خلا کو پُر نہیں کر پائی تھی۔ اور عبد الرزاق چاہ کر بھی اس کی کو دور نہ کر سکے..... اور بخت وہ اس خلا کو پُر کرنا ہی نہیں چاہتا تھا..... ٹھیک ہے اس زندگی میں سب کو سب کچھ تو نہیں ملتا..... اور جو بھی نہیں ملتا..... اسے اس پر صبر کرنا اور اس شے یا رشتے کے بغیر جینا سکھا دیا گیا تھا تو اب اگر اس کی زندگی میں کچھ ”نہیں“ تھا تو it's ok..... وہ اس ”نہیں“ کے ساتھ بہت آرام سے زندگی گزار سکتا تھا۔ یہ ”نہ ہونا“ اس کو تنگ نہیں کرتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بخت عبد الرحمن نے کسی بھی شے کو یا رشتے کو یہ اجازت ہی کب دی تھی کہ وہ اسے تنگ کر سکے، تکلیف پہنچا سکے..... اس درد کے لیے اس کے ہاں ہمیشہ ایک ہی جملہ تھا۔

who the hell are you?

☆☆☆

وہ پورے دو سال بعد گھر آیا تھا..... اب بھی نہ آتا مگر حادثہ ہی کچھ ایسا تھا..... شازیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ تعلقات کی سرد مہری کے باوجود اسے آتا تو تھا ہی..... سفید سوٹ پہنے، آستینوں کو کہنیوں تک موڑے، سیاہ گاگلز لگائے وہ بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ جنازہ گاہ میں کھڑا تھا۔ لوگ آتے اس سے افسوس کرتے، گلے لگاتے، وہ کوئی رسمی سا جملہ کہہ دیتا اور بس..... ہاں اور بس..... اس کے لیے شازیہ کی وفات ایسے ہی تھی جیسے کسی ایکس، وائے، زی کی ہوتی ہے۔ بخت عبد الرحمن..... کی زندگی میں رشتے یا تو تھے یا نہیں تھے..... درمیان کے کسی راستے کا مسافر وہ نہیں تھا..... اس نے ذرا سا مجمع چھٹنے کا انتظار کیا اور اپنے تلے قدموں کے ساتھ ولید کے پاس آیا۔

”I am sorry at your loss“ اس

پھر سے بری طرح الجھتا تھا۔

☆☆☆

”ایکسکوڑی.....“ لہجہ انتہائی پُر تکلف تھا۔
 ”جی۔“ اور اس ”جی“ میں جی بھر کر حیرانی تھی۔
 ”میں آج جا رہا ہوں.....“ وہ کہہ کر چپ ہوا
 اور وہ سن کر حیران ہوئی..... ”جانا ہے تو جاؤ..... اس
 میں بھلا نشر کرنے والی کون سی بات ہے؟ اس کے
 چہرے کے تاثرات پر بڑے واشگاف انداز میں یہ
 بات جیسے رقم تھی۔
 ”مجھے معلوم ہے کہ یہ بات آپ کو کہنے کی
 ضرورت نہیں مگر پھر بھی میں اپنی تسلی کر رہا
 ہوں..... پلیز بابا کا خیال رکھیے گا.....“ بخت سر اٹھا کر
 باہر کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ منہ اٹھا کر اسے.....
 حیرت ہی اتنی تھی۔

”جی ضرور.....“ کہتا تو وہ چاہتی تھی کہ تم کب
 سے رشتوں کی پروا کرنے لگے..... تم نے تو سالوں
 ادھر کا رخ نہ کیا..... باپ کے پیسوں پر عیش کرتے
 ہوئے آج یہ بات یاد آئی..... مگر وہ شدید خواہش کے
 باوجود کچھ نہ کہہ سکی..... ایسا کوئی تعلق تھا کہاں ان
 میں..... کزنز ہونے کے ناتے بھی نہیں.....
 ”شکریہ.....“ اس نے ذرا دیر اسے ٹکا..... اور
 پھر باہر نکل گیا۔

اور ادا عبد المالک اس کی پشت تھکتی رہی۔
 ”کتنا عجیب انسان ہے..... پروا بھی کسی
 ربوٹ کی طرح کرتا ہے۔ جیسے کہہ دیا تو ہو گیا..... تائی
 شازیہ ٹھیک کہتی تھیں۔ یہ صرف تایا ابو کا پیسہ اڑاتا
 ہے..... ورنہ کیا ضرورت تھی اسے شہر، اپنے گھر کو چھوڑ
 کر دوسرے شہر میں دھکے کھانے کی ہاشل کے اخراجات
 تو آخر کو تایا ابو نے ہی برداشت کرنے ہیں
 ناں..... ہونہ.....“ یہ تھی ادا عبد المالک کی بخت عبد الرحمن
 کے بارے میں رائے..... اور اس رائے سے وہ
 یکسر انجان تھا..... وہ فیملی میں آتا جاتا تو کچھ خبر ہوتی
 ناں..... یہ سب ولید اور شازیہ کی وقتاً فوقتاً خاندان بھر

”ٹھیک جا رہی ہے۔“

”تمہارا..... لاہور جانے کا فیصلہ مجھے پسند
 نہیں آیا بخت..... یہاں اسلام آباد میں بھی تو ایک
 سے بڑھ کر ایک یونیورسٹی تھی۔“
 ”آپ جانتے تو ہیں UET لاہور زیادہ
 اچھی ہے۔“
 ”ہاں، تمہیں ہر دوسرا شہر اسلام آباد سے زیادہ
 اچھا لگے گا..... میں جانتا ہوں.....“

اور اس بات پر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ وہ
 دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ فیصلہ کیوں کیا گیا
 تھا..... وہ یہاں اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔
 ”کب تک روکے گے؟“

”دو تین دن تک تو ہوں.....“

”بخت میں کہنا نہیں چاہتا تھا..... پر بیٹے تم اپنی
 اسٹڈی کو سیریس کیوں نہیں لے رہے.....؟“ وہ اس
 سے کہنا چاہتے تھے کہ ولید کو دیکھو..... مگر نہیں کہہ سکے۔
 ”بابا..... یہ بحث ہم پھر کبھی کریں گے..... یہ
 وقت اس بحث کے لیے مناسب نہیں ہے.....“ اس
 نے بڑے آرام سے ان کی بات اڑائی تھی۔

”تایا ابو.....!“ اور اس آواز پر ان دونوں نے
 آواز کی سمت میں دیکھا تھا۔

”تھوڑا سا کھانا کھالیں پلیز.....“ وہ واقعی اس
 فیملی ڈنر کے بعد سے آج اسے دیکھ رہا تھا۔ اداس، ملول
 چہرہ، سرخ ہوتی ناک، روئی، روئی سی آنکھیں..... وہ
 ایک دم جیسے کہیں اتری تھی..... کیا دل میں؟ مذاق کی بھی
 کوئی حد ہوتی ہے۔“ بخت نے سر جھٹکا۔

”انھیں بابا.....“ وہ انہیں اٹھاتے ہوئے بولا۔
 اندر کی سمت جاتے ہوئے، اس نے چاہا کہ وہ
 ادا کو نہیں دیکھے مگر یہ نظریں..... وہ اب تایا ابو کا ہاتھ
 تھامے، ان سے چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتے ہوئے اندر
 کی طرف جا رہی تھی۔

”کیوں ادا عبد المالک..... کیوں؟ تمہارے
 لیے میرے رویے میں تبدیلی کیوں ہے؟“ وہ ایک بار

”آپ کو ماننا بھی نہیں چاہیے بابا.....“ وہ

مسکرایا۔

”یہ کام میں نے کسی ”کی“ کی بنا پر شروع نہیں کیا بابا..... میرا شوق بھی ہے اور میں اپنی ٹورسٹ کمپنی بنانا چاہتا ہوں..... تو بس اسی لیے.....“ وہ چند لمحے اس کے پرسکون چہرے کو گھورتے رہے کہ شاید وہاں تھوڑی سی، ذرا سی بے سکونی پیدا ہو جائے پر نہ جی..... وہ بخت عبدالرحمن تھا..... بحال ہے جو اپنے فیصلوں پر شرمندہ ہو۔

”کب سے کر رہے ہو؟“ اور اس سوال پر اس نے سر کھجایا..... منہ پر اب کے oops والے تاثرات تھے۔

”چھوڑیں ناں یار.....“ اس نے ان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔

”تم.....“ وہ کچھ کہتے، کہتے رک سے گئے۔

”تمہارے گریڈز اسی لیے اچھے نہیں آتے تھے.....“ عبدالرزاق کو جیسے ایک دم قلق ہو رہا تھا۔ وہ اب جھپتی ہوئی نظر سے اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

”مارے گئے.....“ وہ بڑ بڑایا..... اس نے

ترنت ان کے کندھے سے ہاتھ اٹھایا۔

”بخت.....“ ان کی آواز برہم تھی۔

”بابا پلیز..... یہاں بیٹھیے.....“ بخت نے ہاتھ پکڑ کر انہیں بیڈ پر بٹھایا۔

”تعلیم اچھی چیز ہے..... اور یہ اچھی چیز جتنی

میری زندگی کے لیے..... میری گرومنگ کے لیے

ضروری ہے وہ میں حاصل کر رہا ہوں..... پڑھ لکھ کر بھی

تو پیسہ کماتا ہے ناں..... میں اتنا انتظار نہیں

کر سکتا..... پہلے چار سال یونی میں کھپاؤں پھر ہائر

اسٹڈیز اور پھر نوکری کے لیے جوتیاں چٹھاؤں..... نو

نیور..... اتنا انتظار نہیں کر سکتا..... اتنا وقت نہیں ہے

میرے پاس کہ پانچ، چھ سال ضائع کر دوں۔ میں تعلیم

اور کام، دونوں کا تجربے ساتھ، ساتھ حاصل کر رہا

ہوں۔ ہاں کبھی تعلیم میرے کام کو اور کبھی کام میری تعلیم

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2022ء 157

میں پھیلائی جانے والی باتوں کا نتیجہ تھا۔

یہ دوسرا بڑا نقصان تھا جو ان ماں، بیٹے نے اسے پہنچایا تھا..... پہلا یقیناً اس کی اپنی ماں سے دوری تھی..... جب اسے بورڈنگ جانا پڑا تھا..... انہی ماں، بیٹے کی وجہ سے.....

☆☆☆

”تم جارہے ہو.....؟“ وہ قدرے حیرت سے پوچھ رہے تھے..... بیک کی زپ بند کرتے ہوئے..... وہ جیسے اک لمحے کے لیے رکا۔

”جی.....“ اور پھر ایک گہری سانس بھری۔

”کیوں؟“ حیرت اور بڑھی۔

”کچھ کام ہے بابا!“

”ایسے کون سے کام ہیں جو تمہیں ان حالات میں بھی جانے پر مجبور کر رہے ہیں..... اور دو دن بعد ویک اینڈ بھی تو ہے.....“ اب کی بار وہ خاموش رہا۔

”بخت.....“ انہوں نے اس کے کندھے پر

SINCE 2014

ہاتھ رکھا۔

”یہ موقع ایسا نہیں ہے کہ تم.....“

”میرا جانا ضروری ہے بابا.....“ اس نے جیسے

ہار مان کر خود کو اس لمحے کے لیے تیار کیا..... جس سے

طنے کا خوف اسے پچھلے چند برسوں سے تھا۔

”بخت.....؟“ ان کے سوالیہ انداز میں دکھ کے

ساتھ مایوسی بھی تھی۔

”بابا میں جا کر رہتا ہوں..... ایک ٹورسٹ کمپنی کے

ساتھ میں نے معاہدہ کر رکھا ہے..... کل ہمیں جانا ہے۔“

اور وہ بھونچکا رہ گئے تھے..... وہ چپ ہو کر اس کا

چہرہ دیکھنے لگے جو بیک کی زپ کو بند کھول کر رہا تھا۔

اس کا چہرہ پرسکون تھا..... وہ بس ان کا سامنا کرنے

سے کتر رہا تھا..... وہ جانتا تھا کہ یہ بات انہیں تکلیف

دے گی اور اس نے دی۔

”میں نہیں ماننا کہ کسی چیز کی کمی نے تمہیں اس

کام کے لیے مجبور کیا ہے..... میں نے کبھی تم سے غفلت

نہیں برتی.....“

”سرمایہ کہاں سے لاؤ گے اس سب کے لیے؟“
 وہ اب پوچھ رہے تھے۔
 ”لگتا ہے آپ نے میرے اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ
 چیک نہیں کی۔“ وہ مسکرایا۔
 ”کچھ سیونگنز ہیں، کچھ آپ سے ادھار لوں گا.....“
 ”ادھار کیوں؟“ انہیں برا لگا۔
 ”اچھا یہ بحث پھر سہی.....“ اس نے دونوں ہاتھ
 اٹھائے۔

”جار ہا ہوں.....“
 اور انہوں نے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ ان
 کے سینے سے جا لگا۔
 ”یہ سینہ، اس کی گرمی، اس گرمی میں چھپی
 شفقت، محبت، رشتوں کے نام پر پورا خاندان ہونے
 کے باوجود اسے صرف یہ رشتہ میسر تھا۔ اس کا اکلوتا،
 عزیز رشتہ.....“ اس نے جوش سے بابا کو بھینچ لیا تھا۔

☆☆☆

وہ اب بابا کی وجہ سے وقتاً فوقتاً گھر آتا رہتا تھا۔
 ان دو مردوں کے لیے، گھر سنبھالنے کے لیے ایک
 عورت چاہیے تھی۔ عبدالرزاق اب سنجیدگی سے ولید کی
 شادی کا سوچ رہے تھے۔ گھر کے کاموں کے لیے
 ملازمین کا بندوبست تو تھا مگر پھر بھی گھر ایسے تھوڑی ناں
 چلتے ہیں..... جب کوئی کام چھوڑ کر چلا جاتا تو مصیبت
 آجاتی وہ بھی ایسے ہی دن تھے..... وہ ویک اینڈ پر گھر
 آیا ہوا تھا اور بابا نے اسے ادا کے ساتھ بھیج دیا
 تھا..... اور ادا..... وہ حقیقت میں اس کے روتے کو سمجھ
 نہیں سکی تھی..... وہ بخت کی جانب سے اس بے تکلفی کی
 توقع مگر کبھی نہ کرتی۔

”تو پھر.....؟“ وہ بری طرح سے الجھی۔
 ”من موبی سا آدمی ہے..... دفع کرو۔“ اور
 اس نے واقعی ہی دفع کر دیا..... پر نہیں جانتی تھی کہ اس
 کے دفع کرنے سے کچھ حاصل نہ تھا..... وہ کسی کے
 نوٹس میں تھی..... کسی کے دھیان میں آگئی تھی۔ اور وہ
 اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ تقدیر اس کے ساتھ کیا

کوڈ مشرب کر دیتا ہے..... پر یہ تو ہوتا رہے گا مجھے اپنا
 بزنس سیٹ کرنا ہے۔ اسی لیے تو بی بی اے میں ایڈمیشن لیا
 تھا..... بلیوٹی میں یہ کر سکتا ہوں..... چلیں ولید کی طرح
 بہت اچھے گریڈز نہ سہی..... اور مجھے یہ چاہیے بھی
 نہیں..... جتنی میرے کام کے لیے تعلیم ضروری ہے بابا
 اتنا میں پڑھ رہا ہوں..... سو پلیز، مجھے کرنے
 دیں..... مجھے روکیں مت..... آپ دیکھیے گا جس عمر
 میں بچے اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں..... اس عمر میں آپ
 کو اپنی کمپنی بنا کر دکھاؤں گا..... چاہے وہ چھوٹے
 اسکیلو پر کام کرے..... مگر میں بنا کر دکھاؤں گا.....“
 اور وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گئے..... وہ کہتا
 چاہتے تھے کہ ”تم اپنی عمر سے زیادہ میچور کیوں ہو؟ تم
 اتنا بڑا، بڑا کیوں سوچتے ہو..... تم باقی بچوں کی طرح
 سب فکریں باپ پر لا کر آزاد کیوں نہیں ہو جاتے.....
 بے فکرے نوجوان کیوں نہیں بن جاتے؟ تمہیں کس
 نے یہ سکھا دیا کہ تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا
 ہے..... تمہیں کس نے یہ بتا دیا بخت..... کہ تم زندگی کو
 عام بچے کی طرح ٹریٹ نہیں کر سکتے.....“ ایک دکھ سا
 ان کے اندر گھلا تھا۔

”ہاں.....! وہ زندگی کو عام بچے کی طرح ٹریٹ
 نہیں کر سکتا تھا..... اسے یہ کرنے نہیں دیا گیا تھا.....“
 ”آپ کیوں دکی ہو رہے ہیں..... آپ کو تو
 میرے وژن، میری سوچ پر خوش ہونا چاہیے تھا.....“
 ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ نرمی سے بولا۔
 عبدالرزاق نے سر اٹھا کر دیکھا..... ان چمکتی
 ذہین آنکھوں کو دیکھا اور چوم لیا۔

”مجھے تم پر فخر ہوگا بخت..... میں جانتا
 ہوں..... افسوس یہ رہے گا کہ تمہاری ماں یہ سب دیکھنے
 کے لیے نہیں ہے..... وہ کہ جس نے تمہیں یہ سب گھول
 کر پلایا ہے۔“

ماں کے نام پر تکلیف اس کے پورے بدن پر
 اتری تھی..... بروہ اس تکلیف کے ساتھ بھی جینے کا
 عادی تھا..... سو مسکرا دیا۔

خوب صورت بات

کچھ باتیں نہ کہی جاتی ہیں نہ سنی جاتی اور نہ ہی لکھی جاتی ہیں بس محسوس کی جاتی ہیں اور ضروری نہیں کہ..... جو آپ محسوس کر رہے ہیں دوسرا بھی وہ ہی محسوس کرے..... کیونکہ پاؤں تلے چلے جانے کا دکھ ہری اور سوکھی گھاس کے لیے مختلف ہوتا ہے۔

رشتے مان ہوتے ہیں یہ ذرا سی منہاس پا کے ہی جی اٹھتے ہیں۔ تو ذرا سی کڑواہٹ سے مڑ جھکا بھی جاتے ہیں۔ انسان کوئی، کوئی ہی ہوگا جو کھانے کا بھوکا ہو۔ ہاں مان کا بھوکا ہر کوئی ہوتا ہے۔ چند قدم کی دوری پہ کھڑے کو اگر آپ سواری ہونے کے باوجود نظر انداز کر جاتے ہیں اور وقت اور پیسہ ہونے کے باوجود پیغام اپنی آواز میں نہیں دے سکتے تو..... کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ رشتوں کے شجر اپنی جڑوں پہ سلامت رہیں گے..... ہائے سال کی ابتدا میں یہ بات شاید کسی ٹوٹے رشتے کو جوڑنے کا سبب بن جائے۔ جزاک اللہ تعالیٰ

مرسلہ: حدیث اختر، حاصل پور

انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

”بابا! آپ نے میری بریکنگ نیوز کا تو پوچھا ہی نہیں.....؟“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا..... وہ بات اڑانے کا کس قدر ماہر تھا..... انہیں اچھی طرح اندازہ ہوا تھا۔

”بخت.....“ انہوں نے اس کی کلائی پکڑ کر روکا۔

”ہر بات سے کتنی مت کترایا کرو..... کچھ بھید

کھولنے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔“ وہ برہم ہوئے، وہ چند لمحے جوتے کی ٹوک سے زمین کھرچتا رہا۔

”سوال یہ نہیں بنتا..... کہ میری کوئی

intention ہے یا نہیں..... سوال یہ ہے کہ

دوسرے فریق کی رائے کیا ہے..... خیال کیا

ہے..... میرے لیے وہ اہم ہے.....“

کرنے والی تھی۔

☆☆☆

اور پھر جس وقت ولید MS کر رہا تھا..... بخت نے اس ٹورسٹ کمپنی کے ساتھ پارٹنرشپ کر لی کہ جس میں وہ ملازم تھا..... اور جب ولید اسکا لرشپ پر باہر جا رہا تھا تو اس کی پارٹنرشپ 30-70 کی ratio سے 50-50 کی ratio پر آچکی تھی۔ وہ یہ ہی خوشی سلیم ریٹ کرنے گھر آیا تھا۔

”میرے پاس آپ کے لیے ایک نیوز ہے.....“ رات کے کھانے کے بعد جب وہ اور بابا چہل قدمی کر رہے تھے تب اس نے کہا۔

”میرے پاس بھی ایک عدد نیوز تو ہے..... پر کیا

پہلے سنا چاہیے؟ تمہاری نیوز یا میرا خبرنامہ.....“

اور وہ زور سے ہنس دیا۔

”چلیں پہلے آپ اپنا خبرنامہ سنا دیں.....“

”ولید کا رشتہ طے کر رہا ہوں میں..... باہر جانے

سے پہلے اس کا نکاح کرنا چاہ رہا ہوں میں.....“

”کس کے ساتھ، کون ہے؟“ اس نے بے ساختہ

پوچھا۔

”ادا.....“

اس کے قدم بے ساختہ رک سے گئے..... وہ

ایک دم بہت خاموش ہوا تھا۔

”بخت.....“ جانے یہ خاموشی کیسی تھی..... کچھ

منکشف کرتی ہوئی شاید..... یا پھر انہیں سمجھنے میں غلطی

ہو رہی تھی۔

”ادا کی مرضی سے ہو رہا ہے یہ رشتہ.....؟“ وہ

بولا تو آواز بالکل ہموار تھی۔

”ہاں..... دونوں کا ایک دوسرے کی طرف

رجحان دیکھتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے.....“

وہاں نیم ملگجا سا اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں وہ

اس کے چہرے کا تناؤ محسوس کر سکتے تھے..... اس کے

ٹھنک کر رکنے نے جیسے کوئی بات انہیں سمجھائی تھی۔

”بخت تمہاری کوئی intention تھی.....؟“

”ادا عبد المالك، افسوس یہ نہیں کہ تمہارا راجہ جان میری طرف نہیں ہے..... افسوس یہ ہے کہ تمہارا راجہ جان ایک غلط شخص کی طرف ہے۔ تم کسی بھی ایکس، وائی، زی کی طرف راجہ جان رکھتے ہو وہ شخص بخت عبد الرحمن کی فکر کا تو ہوتا..... تمہیں بھلا کون میری طرح چاہ سکتا ہے.....“ اس کے دل میں ایک عجیب درد نے چنگی بھری تھی..... ایک تکلیف نے جیسے اسے کاٹا تھا۔

”تم نے غلط شخص کا انتخاب کیا.....“ اس کا افسوس تھا کہ جاتا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

سامنے اسٹیج پر وہ دونوں ساتھ، ساتھ بیٹھے تھے، اس نے فوکل گلاسز اتار کر آنکھوں کو مسلاتا تھا۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے زندگی کی اس تلخی کو بھی خود میں ضم کر دینا چاہا تھا مگر کم بخت..... وجود پر حاوی ہوتی چلی جاتی تھی۔ دوسرے کسی آزار کی طرح ہینڈل ہوتی ہی نہ تھی۔

”کیا زندگی محض اس وجہ ویران لگنے لگی تھی کہ اس میں ادا عبد المالك نہیں..... کیا محض اسی ایک وجہ سے؟“ اس نے گردن اٹھا کر اپنے ارد گرد پھیلے ماحول کو دیکھا۔ لوگوں کا ہجوم، رنگ برنگے اڑتے آئینے، بچوں کے قہقہے..... اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو، روشنیوں سے نہایا ہوا لان..... خوش رنگ پھول، باتیں، رنگ، خوشبو، آہ..... یہ سب کس قدر بے معنی ہوا تھا..... اس کے دل کو کسی نے دوا لگیوں میں مسلاتا تھا۔ ہونٹ بھیج کر اس نے حلق سے نیچے کچھ اتارا، منہ سے ایک گہری سانس خارج کر کے اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو جکڑا اور ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر خود کو ریلیکس کرنا چاہا..... ہاتھ کی پشت سے گردن کو مسلاتا۔

جب مشک پوری ٹاپ سے نیچے نظر آتی دنیا کو دیکھا ہاں اس نے دیکھا..... جب فیری میڈوز کی تھکا دینے والی ہائیک کے بعد جس نظارے کو اس نے دیکھا تو تب اسے زندگی کس قدر خوب صورت، کس قدر حسین لگی تھی..... کیا اب بھی..... اب کبھی مشک پوری ٹاپ

”اس کا راجہ جان ولید کی طرف ہے بخت!“

”اسی لیے میں آپ کو اپنی بریکنگ نیوز سنانے پر اسی طرح تلا بیٹھا ہوا تھا کہ جس طرح سے نیوز چینل ٹل جاتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ اور عبد الرزاق اس انداز پر بھونچکا رہ گئے انہیں بخت عبد الرحمن کے ضبط سے خوف آیا تھا۔ انہیں اس کے فہم نے بری طرح سے الجھایا تھا۔ کبھی تو وہ عام، نارٹل لوگوں کی طرح رویہ اپنائے، کوئی دکھ محسوس کرے، اداس ہو، رنجیدگی ظاہر کرے مگر نہیں..... وہ زندگی کے ہر آزار کو بڑی آسانی سے کھول کر پی جاتا تھا..... مود آن کر جاتا تھا۔ کوئی تکلیف کوئی بات جیسے اس کے لیے معنی ہی نہیں رکھتی تھی۔

”بخت تم نارٹل نہیں ہو.....“ ان کے تشویش سے کہنے پر وہ مسکرایا۔ ایک زخم خوردہ سی مسکراہٹ.....

”ہاں بابا..... میں نارٹل نہیں ہوں.....“

اس نے اس بات کو بھی بے حد آرام سے مان لیا تھا۔

☆☆☆

کہنے کو اس نے کہہ دیا تھا کہ ”ہاں..... میں نارٹل نہیں ہوں.....“ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس دھچکے سے خود کو سنبھال نہیں پارہا تھا۔ ابھی تو وہ اس کتھی کو سلجھا ہی نہیں پارہا تھا کہ ادا عبد المالك کیوں نوٹس ہوئی تھی اور یہ کتھی کس طرح سے سلجھی تھی..... اس نے تکلیف سے ہنس کر سر جھٹک دیا۔

”محبت.....!“ اس کے سامنے پڑا لپ ٹاپ روشن تھا..... مگر کام پر فوکس کیسے ہوتا..... اس کا تو زندگی ہی سے فوکس مل کر رہ گیا تھا..... وہ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے، ان پر ٹھوڑی ٹکائے، سوچوں میں گم تھا۔

”تو بخت عبد الرحمن! تمہاری زندگی میں جیسے ایک اسی حادثے کی کمی تھی..... بس اسی کی ہی تو کمی تھی..... تمہیں محبت کیسے مل سکتی تھی؟ کیا آج تک وہ ہوا جو تم نے چاہا.....“ ہاتھوں کو سر کی پشت پر باندھتے ہوئے..... وہ کرسی پر ہی نیم دراز ہوا۔ آنکھیں اب بھی باہر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

ایک دم مداخلت کی تھی۔

”یار ہو گیا ناں بس.....“ وہ ناک تک بیزار ہوا۔

”بخت.....“ عبد الرزاق نے اسے اشارے

سے وہاں بیٹھنے کے لیے کہا تھا..... وہ وہاں

بیٹھا..... منظر ریو اسنڈ ہوا..... اس نے گفٹ دوبارہ

پکڑا دیا..... ادا نے سر کے ہلکے سے اشارے سے

شکریہ کہا۔ اور اب اسے وہاں سے اٹھ جانا تھا

مگر..... وہ رک گیا..... ٹھہر گیا۔

”میری دلی دعا ہے کہ یہ رشتہ تمہارے لیے خیر کا

باعث ہو مگر تم نے ایک غلط شخص کا انتخاب کیا.....“ ذرا

سا اس کی طرف جھکتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا گیا

جملہ..... ادا نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر شکا کڈ نظروں

سے اسے دیکھا۔ مگر وہ ادا کو نہیں دیکھ رہا تھا..... وہ

گردن اٹھائے سامنے تکتا تھا۔ اک دم کلک ہوا، فلیش

پڑا اور یہ منظر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

ادا کے دل میں اس شخص کے لیے غصے کا اک

ابال اٹھ رہا تھا۔ اس کی ناپسندیدگی میں اور اضافہ ہوا۔

اس کا جی چاہیوں بد مزہ کرنے پر ساتھ بیٹھے شخص کا سر

توڑ دے..... اسے نفرت ہوئی اس شخص سے.....

”بخت عبد الرحمن، کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ

لڑکیاں اسٹریٹ فارورڈ مردوں کو زیادہ پسند نہیں

کرتیں..... اوہو..... کوئی تو تمہیں سمجھاتا کہ لڑکیاں

یوں غیر رومانوی طریقے سے ٹریٹ نہیں کی جاتیں.....

تم نے ایک لڑکی کے خاص دن پر اس کا موڈ خراب

کیا..... میاں اب یہ بات تمہیں ساری عمر بھگتنی

ہے..... کہ یہ بات وہ بھولنے والی نہیں تھی۔“

☆☆☆

”اس گدھے کو باہر نہیں جانا چاہیے تھا.....“ وہ

بے طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔

”اسے اسکا رشپ ملا ہے بخت.....“ اور وہ جی بھر کر

حیران ہوئے۔ یوں جیسے کہتے ہوں کیا اب بھی نہ جاتا.....

”اور آپ کا خیال کون رکھے گا.....؟“ لہجہ بے حد

... پکپکاتایا ہوا تھا۔

سے زندگی ویسی ہی حسین نظر آئے گی.....؟ ہاں، وہ
آئے گی..... آئے گی..... زندگی کی خوب صورتی محض
اک لڑکی کے نہ ہونے سے کھو کیسے سکتی ہے؟“ وہ ایک
بار پھر denial فیز میں چلا گیا تھا۔ وہ اس کے علاوہ
اور اب کربھی کیا سکتا تھا۔

ہاں نہ ماننا ہی اس غم کا واحد حل تھا مگر وہ نہیں
جانتا تھا کہ یہ کام جلد اسے تھکا دینے والا تھا..... خود کو
گپوز کرتے ہوئے اس نے جیب سے ایک کیس
نکالا..... کھول کر اک نظر اسے دیکھا اور پھر سامنے اسٹج
کی طرف دیکھا۔

”کیا تم جان پاؤ گی کہ اس ایک بریسلٹ کو
خریدنے کے لیے میرے کتنے ماہ کی سیونگ لگی ہے؟ یہ
ایک تولد سونا خرید کر تمہیں دینے کے لیے میں نے کیسے،
کیسے اخراجات کو کٹ لگایا..... اور سب سے بڑھ کر کس
قدر چاہ سے..... کتنی محبت سے یہ خریدا گیا تھا.....“ وہ
ہنس دیا..... زندگی کے اس مذاق پر اسے زوروں کی
ہنسی آتی تھی۔

”کوئی نہیں ادا عبد المالك.....“ وہ کرسی سے اٹھا۔
”میں سہ لوں گا.....“ اس کے قدم اسٹج کی
طرف بڑھتے گئے۔

”میں زندگی کا یہ وار بھی سہ لوں گا.....“ وہ اب
اسٹج پر ولید کے برابر آ کر بیٹھا۔

”گو کہ یہ وار مجھے تمہاری صورت میں بار، بار
سہنا ہوگا..... مگر یہ کہ بخت عبد الرحمن اپنے کو سنبھال
لے گا.....“ وہ اب ولید سے مسکرا کر مصافحہ آتے
ہوئے اسے مبارک باد دے رہا تھا۔

”یہ میں نے تمہیں اس حوالے سے دینے کا نہیں
سوچا تھا..... مگر یہ کہ یہ تمہارے لیے ہی تھا..... سو تمہیں
ہی ملنا چاہیے.....“

اس نے بریسلٹ ادا کی طرف بڑھایا۔ بخت
اٹھ ہی چاہتا تھا کہ.....

”بھائی جان آپ ذرا اس کرسی پر آ کر بیٹھیں
اور یہ گفٹ دوبارہ اپنی بھالی کودیں.....“ تو ٹوگرافرنے

ساتھ، ساتھ وہ اپنا بھی کوئی ٹورارنچ کر سکے۔ کسی بھی قسم کی سپورٹ کے بغیر۔ ابھی وہ کسی سے مل کر آرہا تھا..... بیٹھا بھی نہیں تھا کہ فون بجنے لگا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے جوتے اتارے اور جب فون سن کر فارغ ہوا تو عبدالرزاق اس کی طرف متوجہ تھے۔
”تم نے جانا نہیں؟“
”کہاں؟“ وہ عجیب غائب دماغی کی کیفیت میں تھا۔

”لاہور واپس۔“ اور اس کی یادداشت جیسے واپس آئی تھی۔ اس نے آرام دہ انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اس تمام عرصے میں وہ ایک دفعہ لاہور جا کر پھر واپس آیا تھا۔ عبدالرزاق اس کی اتنی جلدی واپسی پر حیران تو ہوئے مگر یہ سوچ کر چپ رہے کہ شاید وہ ان کے خیال سے آیا ہے مگر اب تو ویک اینڈ گزرے بھی تین دن ہو چکے تھے۔
”بخت!“

”میری پارٹنرشپ پھر سے 30-70 پر آگئی ہے۔“ اس نے یوں اطلاع پہنچائی جیسے یہ سب سے اہم بات تھی اور انہوں نے یوں سنی جیسے یہ سب سے غیر اہم بات تھی۔
”تو.....؟“

”تو کیا؟“ وہ پھر سے غائب دماغی کی کیفیت کا شکار ہوا۔

”افوہ..... اب پڑھائی کا کیا؟“ وہ جھنجھلائے۔
”مائیگریشن کروالی ہے۔“ اس نے یہ اطلاع یوں پہنچائی جیسے یہ سب سے غیر اہم بات تھی۔ انہوں نے یہ اطلاع یوں سنی جیسے یہی تو سب سے اہم بات تھی۔ آف..... وہ باپ بیٹا۔
”کیوں؟“ وہ شدید حیران ہوئے۔

”سارے فرض ولید کے ہی ہیں کیا؟“ وہ ٹھٹکے اور پھر بڑے جوش سے اسے گلے لگایا تھا۔ ایک عمر کے بعد وہ گھر لوٹ کر آیا تھا۔ اس کے پیروں میں پڑا چکر جیسے ختم ہوا تھا۔ ان کا خوش ہونا بنتا تھا۔

”تم ہونا..... میرا دوسرا بازو.....“ یہ تو موقع تھا اسے گھبرنے کا..... وہ بڑے دل سے مسکرائے۔
”اور کیا سارے فرض ولید کے ہیں؟“
”سارے حق بھی تو اسی کے ہیں.....“ وہ آج کل یوں ہی تلخ ہو جایا کرتا تھا..... اس کے منہ سے بلا ارادہ پھسلا تھا..... عبدالرزاق کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا..... وہ لکھت خاموش ہوئے۔
”آئی ایم سوری.....“ چند ثانیے بعد وہ پست

آواز میں بولا۔
”کوئی بات نہیں..... ادا آجایا کرے گی..... شازیہ کے بعد بھی اس ہنگی نے بڑا خیال کیا..... اب بھی جیسے تیسے گزارہ ہو ہی جائے گا.....“
اس نے ایک گہری سانس بھر کر انہیں دیکھا۔ وہ کھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے تکلیف ہوئی..... وہ ہونٹ بھیجنے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے کہ سارے فرض ولید کے ہیں کیا؟ اسے فیصلہ کرنا تھا باپ یا اس کا خواب۔

☆☆☆

مائیگریشن کروانے میں کچھ وقت تو لگا تھا مگر ہو گئی تھی۔ اب فرق اس بات سے نہیں پڑتا تھا جو تعلیم پانچ چھ سالوں میں ختم ہوئی تھی..... چلو اب ایک آدھ سال اور لگ جاتا۔ فرق اسے اپنی پارٹنرشپ متاثر ہونے سے پڑا تھا۔ کہاں وہ 50، 50 پر چلی گئی تھی مگر اس کے یوں آنے کے فیصلے نے اسے متاثر کیا تھا وہ پھر سے 30-70 پر پہنچ گئی تھی۔ اتنے سالوں کی محنت سے بنائے گئے تعلقات، پی آر..... نام..... محنت..... سب جیسے ڈوبنے کو تھا۔ وہ اسلام آباد میں بیٹھ کر کیسے اس 30 فیصد کو بھی maintain رکھ سکتا تھا۔ اسے اب یہ سوچنا تھا، نئے سرے سے تعلقات بنانے تھے، نام بنانا تھا..... اور یہ سب آسان نہیں تھا..... اس میں وقت اور پیسہ لگتا تھا۔ سارا، سارا دن وہ فون پر بڑی رہتا۔ وہاں سے جان چھوٹی تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس 30 فیصد پارٹنرشپ کے

بل لیے وہ درشت لہجے میں بول رہا تھا۔ یہ اس کا انداز تو نہ تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“

”ضروری ہے یہ بات میں کچھ ہونے پر ہی آپ سے کہوں؟“ وہ اور بکڑا۔

”نہیں ضروری تو نہیں..... مگر تمہارا انداز بتلا رہا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔“

”چلیں جو بھی ہوا ہے، اسے چھوڑیں۔ وہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔ میں جو آپ سے کہہ رہا ہوں بہتر ہے یہ بات آپ خود اس سے کہہ دیں۔ میں نے کہا تو اسے برا لگے گا۔“

”وہ میرے خیال سے آتی ہے بخت!“

”آپ کے خیال کے لیے میں کم ہوں بابا؟“ وہ

لاجواب ہوئے اور اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے۔

کیا ہوا تھا جو وہ یوں برہم تھا۔

☆☆☆

”ادا!“ وہ ان کی الماری سیٹ کر رہی تھی۔ ان کے بلانے پر ہاتھ روک کر پلٹی تھی۔

”بخت سے کوئی بات ہوئی ہے تمہاری؟“

”میری بات؟..... نہیں تو.....“ کہنے والے کو کب یاد رہتا ہے کہ اس کے لفظوں نے کیا کمال کیا ہے، سو وہ بھی بھولی بیٹھی تھی۔

”اچھا!“ وہ ذرا حیران ہوئے۔

”کیوں..... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ

ایک بار پھر سے اپنے کام میں مگن ہو کر بولی۔

”ایسے ہی..... بخت کا موڈ ٹھیک نہیں تھا کہہ رہا تھا کہ ادا کو کہیں روز، روز یوں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اور چھن سے وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آگرا۔ اس کے ہاتھ ساکت ہوئے تو دل ایک دم دھڑکا تھا۔

”ہیں! اس نے تایا ابو کو بتا دیا۔“ وہ اپنی جگہ پر چوری ہوئی۔ اس نے چاہا کہ وہ بتا دے کہ کیا ہوا تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ دسمبر 2022ء (163)

”اتنے بڑے، بڑے فیصلے اکیلے ہی کر لیے..... بتایا بھی نہیں۔“ وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولے۔

”عادت ہے بابا!“ وہ مسکرایا اور ان کا تہمتا چہرہ دیکھا۔

”بر فیصلہ اپنی قیمت رکھتا ہے اور وہ قیمت آپ کو ادا کرنی پڑتی ہے..... قطع نظر اس بات سے کہ فیصلہ چھوٹا ہے یا بڑا..... آپ کو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔“

and I really paid

baba۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے اپنے سگے باپ کو دیکھ کر سوچا تھا۔

☆☆☆

”ادا.....!“ اور وہ اس طرزِ مخاطب پر بل کھا کر مڑی۔

”بھابی ہوتی ہوں آپ کی۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ اسے بخت کا یوں پکارنا معلوم نہیں کیوں بے حد برا لگا تھا اور بخت..... اس نے ایک لمحہ نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ادا بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں اور وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا..... ادا نے اسے اپنے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ابروؤں کے درمیان یک دم تیوریاں نمودار ہوئی تھیں۔ جیسے ادا کا اسے یوں ٹوکنا سخت ناگوار گزرا ہو۔ اور وہ اس کے پہلو سے ہو کر نکل گیا۔ اور پھر جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑا تھا..... وہ نظریں..... یک دم اسے جھرجھری آئی۔

”معلوم نہیں کیوں مجھے اس شخص سے اتنی چڑ ہے۔“

☆☆☆

”بابا!“ وہ کتاب پڑھ رہے تھے اس کے یوں بلانے پر چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ ادا کو منع کر دیں یہاں روز، روز مت آیا کرے۔ دو ہی تو لوگ ہیں، ہر کام کے لیے ملازم موجود ہیں۔ خانساں کا بھی انتظام ہو چکا ہے۔ میرا نہیں خیال اب اسے یوں تکلیف کرنے کی ضرورت ہے۔“ وہ چپ چاپ اس کی تقریر سنتے رہے۔ ماتھے پر

”اگر میں کہوں کہ اس نے مجھ سے ایک دھیلا بھی نہیں لیا تو؟“

”ہونہہ..... یہ کیسے ممکن ہے؟“ کیا قارون اپنے خزانے کی بجی اس کے نام کر کے مرا تھا؟“

”ولید! یہ سب کچھ جتنا تمہارا جانتا اس کا بھی ہے۔ اس بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کرنا۔“ دو ٹوک لہجے میں بات کہتے ہوئے انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

”ٹرن..... ٹرن..... ٹرن.....“

آواز تھی یا صور اسرافیل، سیدھی دل پر پڑتی تھی۔

”ٹرن..... ٹرن..... ٹرن.....“

اتنے بڑے گھر کی خاموشی اس آواز سے ایک چھناکے سے ٹوٹتی تھی۔

”ہیلو!“ اور ریسپور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر خوف زدہ انداز میں ریسپور کو دیکھا کہ جہاں سے ابھی آواز کے نام پر اک شور سنا کی دیتا تھا۔

کہنے والے نے کیا اسے گمان و یقین کی دنیا سے پرے کسی کوہ قاف کی کہانی سنائی تھی جو وہ یوں ہوش و حواس سے بیگانہ نظر آئی تھی؟ پھر ٹرانس کی سی کیفیت میں اس نے ایک تصویر نکالی..... وہ چہرہ..... وہ چند لمحے اس چہرے کو نگہاتی رہی اور پھر نفرت سے یک دم اس چہرے پر تھوک دیا۔ تصویر اس کے لرزتے ہاتھوں سے نیچے جا گری اور اب وہ ہڈیانی انداز میں پیر کی جوتی سے اس چہرے کو پکھل رہی تھی کہ لکھت وہ ساکت ہوئی، اپنے ہی عمل پر حیران ہوئی اور پھر تیزی سے تصویر کو اٹھایا، پیار سے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے میں بھینچتے ہوئے اک نام چیخ کی صورت اس کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔

”ولید.....!“

(باقی آئندہ)



مگر نہ جانے کیوں وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”یہ بخت!“ اس نے دانت پیسے تھے۔ اس کی ناپسندیدگی میں کچھ اور اضافہ ہوا تھا۔

☆☆☆

زندگی چل رہی تھی۔ دوڑ رہی تھی۔ ولید کی کامیابیوں کا سلسلہ جاری تھا اور ادھر بخت کی اسٹڈیز تھیں کہ بات کئی سالوں پر جا رہی تھی۔ لیکن..... اس نے اپنی ٹورازم کمپنی بنالی تھی۔ چھوٹے اسکیل پر ہی سہی۔ وہ اس خوشی کو سیلبریٹ کرنا چاہتا تھا اسی لیے عبدالرزاق نے پورے خاندان کو مدعو کیا تھا جس نے سنا حیران ہوا۔ خاندان والے جس بخت کو جانتے تھے وہ اس سے یہ امید نہیں رکھتے تھے کہ وہ یوں..... ایک دن اپنی کسی بھی کمپنی کا مالک ہوگا۔ جو بھی تھا بہر حال یہ ایک خوش آئند بات تھی جسے ٹھیک طور پر سیلبریٹ کیا گیا تھا اور جب تصاویر ولید کے پاس پہنچیں تو.....

”بابا! یہ کیا کرتا پھر رہا ہے؟ اور سب سے افسوس کی بات یہ کہ آپ اس کی حماقتوں کو سیلبریٹ کرتے پھر رہے ہیں؟“

”اپنا بزنس شروع کرنا تمہیں حماقت لگتا ہے ولید؟“

”یہ..... یہ بزنس ہے اس کا؟ نرا پیسے کا زیاں..... چار دن بھی نہیں چلا پائے گا۔ ایک BS تو چار سالوں میں مکمل ہوا نہیں اس سے..... وہ کرے گا بزنس..... ہونہہ.....“ وہ اس قدر تنفر سے بولا کہ عبدالرزاق شاکد رہ گئے۔ لیکن انہیں اس طرح شاکد ہونا نہیں چاہیے تھا۔ انہیں پتا ہونا چاہیے تھا کہ ولید کے اندر بخت کے لیے کس قدر زہر موجود ہے۔

”جو بھی کر رہا ہے ولید! اپنی زندگی کے ساتھ کر رہا ہے۔ تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ مرد لہجے میں بولے۔

”کیوں..... کیوں نہیں ہے ضرورت..... وہ میرے

باپ کا پیسا ڈار رہا ہے اپنی حماقتوں کی نذر کر رہا ہے۔“

”اوہ..... تو اس قدر تمللانے کی وجہ یہ تھی۔“

انہیں یہ سمجھنا چاہیے تھا۔